انڈو یجوئل لینڈ
انفرادی آزادی کے لئے کوشاں

فرد

شمارہ نمبر ۱۶ اکتوبر ۲۰۱۳ء

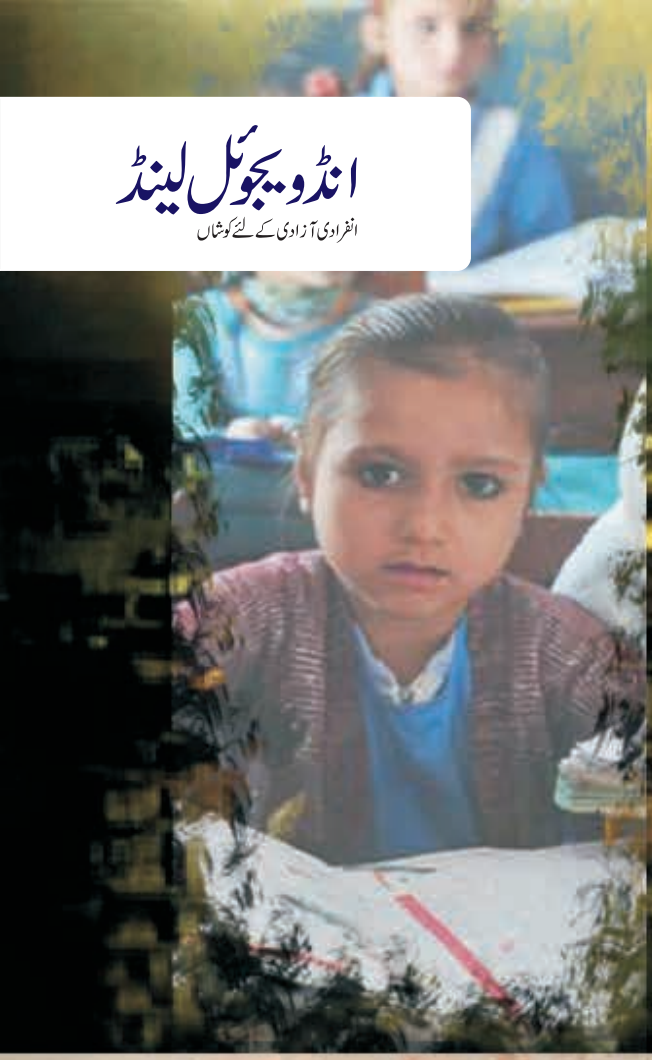

میں ۱۸ کروڑ میں سے ایک ہوں!

اور آپ؟

Friedrich Naumann STIFTUNG FÜR DIE FREIHEIT
کے تعاون سے

فرد

شمارہ نمبر ۱۶ اکتوبر ۲۰۱۳ء

فہرست

ایڈیٹر کی میز سے	۱
انسانیت؟	۲
بگڑتے شہر	۴
تکا لگاؤ	۷
ییپ ایک سفر	۱۰
تعلیم ایک حق یا فرض بھی؟	۱۴
بوم بوم ۱۱	۱۸
قدم بڑھاؤ : قدم جماؤ	۲۱
۲۰۱۴ء کا پاکستان	۲۳
بک ریویو: "دی لاسٹ مغل دی فال آف ڈائینسٹی .دہلی ۱۸۵۷ء"	۲۶
فلم یا حقیقت؟	۳۰

ایڈیٹر:
سندس سیدہ

کوارڈینیشن: خرم سلیم
حمزہ خان ، سید فہد الحسن

کارٹونسٹ :
شاہ تون

ڈیزائین:
عدیل امجد

پبلشر:
انڈویجوئل لینڈ پاکستان

آئی ایس بی این ۹۷۸-۹۶۹-۹۵۸۲-۲۴-۰

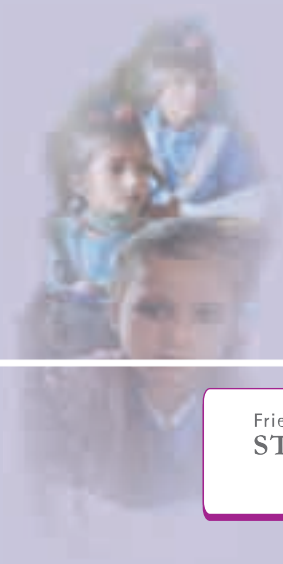

Individualland
Creating space for the individual
نمبر ۱۲۔ بی، سٹریٹ نمبر ۲۶، سیکٹر ایف ۸/۱، اسلام آباد

Friedrich Naumann STIFTUNG FÜR DIE FREIHEIT
کے تعاون سے

ایڈیٹر کی میز سے

پیارے قارئین!

مجھے آفس پہنچنے میں دیر ہوگئی اور اس کی وجہ ایک دفعہ پھر دھماکے میں لقمۂ اجل بننے والوں کے پیاروں کی تڑپ تھی، جو ان کو سڑکوں تک لے آئی تھی۔ ۲۲ ستمبر ۲۰۱۳ء کے واقعے میں ہم سے جدا ہو جانے والے ہمارے مسیح بھائیوں اور اس میں زخمی ہونے والوں سے معذرت کرتے ہوئے اس واقعے کی مذاہمت کرتی ہوں۔ یہ کیسی خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے، جہاں کبھی ہمیں کسی کے کندھے پر سر رکھ کے رونا پڑتا ہے تو کبھی کہیں وہ کندھے ہی ہم سے بچھڑ جاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں دہشتگردی کے جو حالات ہیں ان سے تو ہم سب تنگ آ ہی چکے ہیں لیکن کیا اس ڈر اور خوف کو ایسے ہی اپنی آنے والی نسلوں تک منتقل کر دیں گے؟ یا اس ڈر و خوف کے سایوں کو ان کے سروں سے ہٹانے کے لیے کچھ کریں گے؟ پہلی بات تو یہ ہے اگر ہم یوں ہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے تو ہماری آنے والی نسلیں اور ہم باقی رہیں گے بھی یا نہیں؟

آپ دنیا کے کسی کونے میں بھی ہیں، کسی بھی رنگ نسل اور مذہب سے آپکا تعلق ہے آپ ایک فرد ہیں بحیثیت ایک فرد آپ کے کچھ حقوق و فرائض ہیں۔ لیکن ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم حق کی بات تو سب سے پہلے کرتے ہیں لیکن جہاں فرض نبھانے کی باری آتی ہے تو ہم اندھے، گونگے اور بہرے بن جاتے ہیں۔ اس دفعہ کا یہ شمارہ احساسات اور ان افراد کی کاوشوں سے بھرا پڑا ہے جنہوں نے ملک کو سنوارنے میں اہم کردار ادا کیے ہیں۔ انہوں نے خود کو بارش کے پہلے قطرے کے طور پر متعارف کروایا۔ ہماری پوری ٹیم کی یہ کوشش رہی ہے کہ ہم اس شمارے میں آپ سے ان شخصیات کا ذکر کریں جو ہمارے لیے امید کی پہلی کرن ثابت ہوئے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم نے ملک کو پیش آنے والی تشویشناک صورتحال کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ہماری ٹیم نے ناکامیوں، کامیابیوں اور کامیابی کی سیڑھی بننے والے افراد اور ان کی کاوشوں کا ذکر ایک مختلف انداز میں آپکے سامنے پیش کرنے کی ایک حقیر کوشش ہے۔

پاکستان میں دہشتگردی کی بات ہو اور افغانستان کا ذکر نہ ہو یہ ممکن ہی نہیں۔ ان حالات کو مدِ نظر رکھ کے آرٹیکل "۲۰۱۴ء کا پاکستان" لکھا گیا۔ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہم ایک آزاد اور خودمختار ریاست میں رہتے ہیں، لیکن ایک ایسی کتاب بھی ہے جو ہمیں ماضی کے جھروکوں میں لے جاتی ہے، پاکستان بننے سے پہلے کے حالات و واقعات کی جانب، ہمارے عظیم شعراء، مغل حکومت کا زوال اور دہلی میں ہونے والی جنگوں کی داستانیں پڑھنے والوں کو اسی دور میں لے جاتیں ہیں۔ ایسی ہی ایک کتاب "دی لاسٹ مغل دی فال آف ڈائینسٹی۔ دہلی ۱۸۵۷ء" کا ریویو جو کہ ولیم ڈالریمپر کی مشہور کتاب ہے کو اس شمارے میں شامل کیا گیا۔

دین کی بات آتی ہے تو ہم لوگ اس معاملے میں بہت حساس ہیں۔ دین کے نام پر ایک لفظ گوارا نہیں ۲۰۱۳ء کی رمضان ٹرانسمیشن کی بات کی جائے تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارا میڈیا کتنا آزاد ہے، جہاں دین کے ٹھیکیدار بکتے نظر آتے ہیں اور ایک ہم ہیں کہ پھر بھی ان ہی کی اندھی تقلید کیے جا رہے ہیں۔ جب ہم انفرادی آزادی کے نشے میں سرشار ہوتے ہیں تو یہ بھول جاتے ہیں کہ ہماری آزادی وہاں ختم ہو جاتی ہے جہاں سے دوسرے کی ناک شروع ہوتی ہے۔ لیکن ان سب میں سماجی ذمہ داری کہاں ہے؟ آیئے ہمارے ساتھ آپ بھی اس آرٹیکل "تکا لگاؤ" کو پڑھیے مل کر تلاش کرتے ہیں کہ ہم کہاں کھڑے ہیں ہم کن کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن رہے ہیں۔ ہمارے ملک میں صرف ایسے لوگ نہیں ہیں جو غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کر کے بھی ناداں لوگوں کے دلوں پر راج کر رہے ہیں، بلکہ وہ راج دلارے جو اپنا فرض ادا کر کے میدان مار چکے ہیں وہ بھی ہمارے آس پاس ہی بستے ہیں۔ ان تمام لوگوں کی داستانیں اور میدان تو جدا جدا ہیں لیکن مشن صرف ایک ہی ہے۔ پاکستان کے لیے کچھ کر دکھانے کا مشن۔ ان کے کارناموں کی محض چند جھلکیاں بھی ان آرٹیکلز "تعلیم ایک حق یا فرض بھی؟"، "بوم بوم ۱۱" اور "ییپ ایک سفر" میں پڑھتے چلیں۔

اور صرف یہ ہی نہیں ان کے علاوہ بھی چند ہماری ٹیم کی کوششیں مزید آرٹیکلز کی صورت میں آپکے ہاتھ میں موجود اسی شمارے میں ہیں۔ اس امید کے ساتھ میں آپ کو یہاں چھوڑے جا رہی ہوں کہ ہم اور آپ امید کی شمع جلائے کسی مسیحا کا انتظار کرنے کی بجائے اپنی انفرادی آزادی کو سماجی ذمہ داری کے ساتھ نبھائیں گے۔ اس شمارے کے بارے میں اپنی رائے سے آگاہ ضرور کیجئے گا۔

اگلے شمارے تک کے لیے اجازت!

سندس سیدہ

انسانیت؟

سندس سیدّہ

میں ابنِ بطوطہ یا مستنصر حسین تارڑ نہیں جو سفر نامے لکھوں لیکن ہاں میرے ایک سفر نے یا پھر اس سفر کے ہمسفر نے مجھے اپنے قلم کی طاقت کو استعمال کرنے اور اپنی بات آپ تک پہنچانے پر مجبور کر دیا۔ یہ میرا سفر نہ تھا بلکہ شاید اس شخص کے سفر کی نہ ختم ہونے والی داستان ہے جو ہمارے جیسے بے حس معاشرے میں پیدا ہونے کی سزا کاٹ رہے ہیں۔

ابوظہبی ایئر پورٹ پہ پاکستان واپس آنے کا انتظار کرنا میرے لیے صبر کا امتحان تھا۔ آخر وہ لمحہ آ ہی گیا جب میں جہاز میں بیٹھ کے سوچ رہی تھی کہ ابھی چند گھنٹوں کے بعد میں اپنے ملک میں اپنے خاندان کے ساتھ ہوں گی۔ سب مسافر آ چکے تھے لیکن اب بھی میرا کیبن تقریباً خالی تھا آخر اب کس کا انتظار تھا؟ ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ شلوار قمیضوں میں ملبوس، دیکھنے میں ہی ناخواندہ اور دیہاتی لگنے والا لوگوں کا ایک ہجوم ہمارے کیبن کی طرف آیا۔ ان میں سے ایک نوجوان میرے ساتھ والی سیٹ پہ بیٹھ گیا۔

ابھی جہاز اپنی منزل کی طرف روانہ ہوا ہی تھا کہ میرے ساتھ بیٹھے اس نوجوان

نے معصوم بچوں کی طرح کھڑکی سے دیکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا کہ اب جہاز ہوا میں اڑے گا؟ میں نے بہت حیران ہو کے اس سے پوچھا کہ تم پہلی دفعہ جہاز میں بیٹھے ہو تو تم ابوظہبی کیسے گئے تھے؟ اس نے کہا سمندری جہاز میں گیا تھا۔ اس بات کا جواب دیتے ہوئے بھی اس کی نظریں کھڑکی سے باہر ہی تھیں۔ میں نے اس سے اسکا نام پوچھا: فاضل۔۔۔ نظریں اب بھی باہر ہی تھیں۔

ابھی میں اس سے بات کر ہی رہی تھی کہ ایئر ہوسٹس میرے پاس آئی اور مجھ سے پوچھا کہ کیا میں آپکی سیٹ تبدیل کر دوں یا آپ یہاں ٹھیک ہیں؟ شاید میں ہاں کہہ دیتی اور ایک خوبرو نوجوان کے ساتھ کافی کے چسکے لیتی اور باتیں کرتی ،اپنے ۳ گھنٹے گزارنا بہتر سمجھتی یا کسی ایسی لڑکی کے ساتھ بیٹھتی جس سے نئے فیشن پر بات کر سکوں لیکن نہ جانے کیوں کوئی تجسس تھا یا میرے اندر کی انسانیت جاگ چکی تھی کہ میں نے اس نوجوان کے ساتھ ۳ گھنٹے گزارنے اور اس کی زندگی کے چند لمحات کے بارے میں جاننے کو بہتر سمجھا۔ مجھے یہ تفریق سمجھ نہ آئی کہ آخر مجھے اس شخص کے پاس بیٹھنے یا نہ بیٹھنے کے بارے میں کیوں پوچھا جا رہا ہے؟ جب سب مذاہب انسانیت کا درس دیتے ہیں۔ لیکن یہ تو ایئر ہوسٹس کی ڈیوٹی تھی۔

یہ وہ نوجوان ہے جو بلوچستان کے علاقے ژوب سے اپنے سفر پہ روانہ ہوا۔ تیس تیس ہزار روپے میں ۲۲ لوگوں نے اپنے بوڑھے والدین کا سہارا بننے، تو کسی نے اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے ایک سفر کا آغاز کیا۔ ۳۰ ہزار روپوں میں یہ لوگ ۳ ماہ کے سمندری سفر کی صوبتوں کو جھیلتے ہوئے آخر اپنی عارضی منزل تک پہنچ ہی گئے۔ ۲ سال فاضل ابوظہبی میں ایک ورکشاپ پہ کام کرتا رہا۔ اور آخر ایک دن وہ ویزہ نہ ہونے کی وجہ سے پکڑا گیا۔ اور ۱۵ دن جیل میں رہنے کے بعد آج وہ ڈیپورٹ ہو کے جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ اور بھی ۴۰ لوگ تھے جو سب جیل سے آ رہے تھے اور اپنے ملک واپس جا رہے تھے۔ لیکن اس کو یہ نہیں

پتہ تھا کہ اسلام آباد سے وہ بلوچستان اور سندھ جہاں ان کے گھر ہیں وہاں تک وہ کیسے پہنچیں گے۔ نہ پاسپورٹ اور نہ ہی سامان یہاں تک کہ ان کے پاس چند روپے بھی نہیں تھے۔

میں نے سیٹ کے سامنے لگی سکرین پر گیم کھیلتے ہوئے چند مزید سوالات سوچنے کی کوشش کی جو میں اس سے پوچھ سکوں۔ کہ اچانک اس کی آواز آئی۔۔۔ مجھے بھی اس پہ کچھ لگا دو، میں نے اس کو کہا کہ انگریزی میں یا عربی میں؟ اس نے کہا کسی میں بھی میں تصویر تو دیکھوں گا ناں۔ میں نے اپنا ہیڈ فون لگا کر اسکو فلم لگا دی۔ اب آس پاس کے اور نوجوان جو اس کے ساتھی تھے وہ بھی متوجہ ہو گئے اور ہیڈ فون ڈھونڈنے لگے۔ کہ اچانک کیبن کریو کھانے کی ٹرالی لے کے آتا نظر آیا۔ میں نے اس کو بلا کے باقی ساتھیوں کو بھی ہیڈ فون دینے کا کہا، وہ میرا شکریہ ادا کرتا ہوا ان کو پہلے ہیڈ فون دینے چلا گیا۔ شاید میری طرح وہ بھی یہ جان گیا تھا کہ میسلو کی تھیوری میں روٹی، کپڑا، مکان بنیادی ضرورت ہونے کے باوجود اس وقت ان کی بنیادی ضرورت اس تھیوری کے مطابق نہیں رہی۔ یہ ہی وجہ ہے کہ انسان نے بے شمار تھیوریاں بنائیں لیکن کوئی تھیوری انسان کو انسان نہ بنا سکی۔

میرا اپنے آپ سے سوال تھا کہ کیا یہ جو لوگ جا رہے ہیں ان کی ذمہ داری حکومت لے گی؟ کیا ان کو پاکستان میں بھی قید ہو گی؟ یہ اسلام آباد سے کوئٹہ اور سندھ کیسے جائیں گے؟
لیکن کبھی میں سوچتی کہ جو انسان اتنی مسافت طے کر کے کسی انجان ملک جا سکتا ہے جہاں کی زبان بھی اور ہے تو اپنے ملک میں ہی دوسرے شہر بغیر پیسوں کے سفر نہیں کر سکتا؟ سوالات کا ایک سمندر تھا جو میرے ذہن کے کوزے سے امنڈ رہا تھا۔

فاضل کو میں نے کہا کہ اب تم اپنے ملک میں کام کرو گے؟ تو اس کا جواب اب بھی نا میں تھا اس نے کہا کہ اپنے ملک میں میں اتنا نہیں کما سکوں گا جتنا ادھر کما لوں گا۔ اور میرے اس سوال پہ کہ پھر ڈیپورٹ ہو کے مفت میں ملک واپس آ جاؤ گے وہ ہنس دیا۔ ہمارا طیارہ اب اسلام آباد میں اترنے کی تیاری کر رہا تھا کہ تمام ڈیپورٹ ہوئے نوجوانوں کو ایک ایک فارم تھما دیا گیا۔ ان میں سے بہت سے نوجوانوں کو پڑھنا لکھنا نہیں آتا تھا، اور ایک دفعہ پھر میں ان کی امید بنی میرے ہاتھ میں سب اپنے فارم اور شناختی کارڈ تھمائے جاتے تھے اور میں ان کو بھر کے واپس کرتی جاتی۔ ایک ان پڑھ نوجوان ایک انجان ملک میں انجان لوگوں میں کام کر سکتا ہے ان کی زبان کے فرق کے باوجود وہاں ان کے لیے گنجائش ہے تو ہمارے ملک کی زمین ان پہ کیوں تنگ کر دی گئی؟

میں ذہن میں بے شمار سوالات لیے ائر پورٹ میں داخل ہوئی اور اب.....
میرے سامنے پورٹروں کا ایک ہجوم تھا اور مجھے فاضل کی بات صحیح لگی کہ پاکستان میں کچھ بھی نہیں ہے میں نے ایک کیری بیگ کے ہوتے ہوئے بھی ایک پورٹر کو اشارہ کیا کہ وہ میرا سامان اٹھائے۔ میں کسی اور فاضل کو اس مسافت سے بچانا چاہ رہی تھی یا میں نے انجانے میں یہ حرکت کی۔ ہم میں یہ احساس کہاں سے آ گیا کہ کسی اور کے بچے بھوکے ہیں اور وہ حلال روزی کما رہا ہے تو اس کی مدد کریں میں بھی تو اسی بے حس معاشرے کا حصہ ہوں۔ اس بات کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب ہم کسی اور ملک میں انجان لوگوں میں ہوتے ہیں اور آپکی بات سمجھنے والا کوئی بھی نہیں ہوتا۔ لیکن جب اپنے ملک کے لوگ ہی آپکے پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچنے لگیں تو اس کے بارے میں میں یہی کہوں گی جو اکثر میں اپنی امی کو اس بات کے جواب میں کہتی ہوں۔ جب بھی وہ مجھے کہتی ہیں کہ بیٹا اپنا مارے گا تو چھاؤں میں ڈالے گا یہ محاورہ ایسے ہی نہیں بنا۔ اور میرا جواب یہ ہی ہوتا ہے کہ امی آج کے دور میں محاورہ تبدیل ہو گیا ہے۔ اب اپنا وہاں مارتا ہے جہاں پہلے سے چوٹ لگی ہو۔

مصنفہ انڈو یجوئل لینڈ پاکستان میں ایک ریسرچ افسر کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں اور فرد رسالے کی ایڈیٹر بھی ہیں۔

بگڑتے شہر

یحییٰ احمد

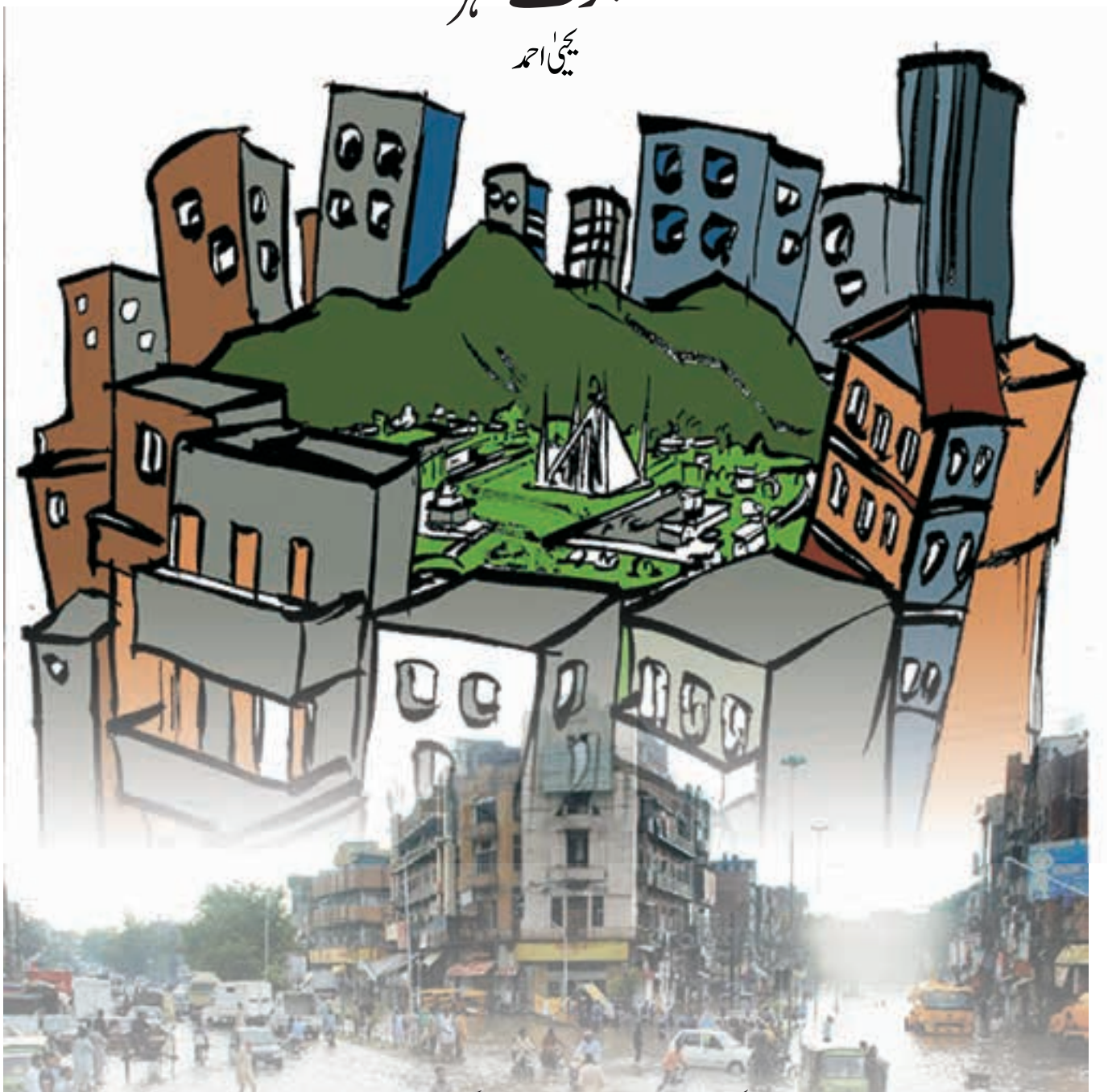

اسلام آباد شہر میں بارش کا نظارہ ہمیشہ سے ایک مخصوص کشش رکھتا ہے، مگر پچھلے چند سالوں میں اس باران رحمت کی وجہ سے شہر میں جگہ جگہ سیلاب کی مانند آلودہ پانی اکٹھا ہوتا نظر آتا ہے۔ جہاں پہلے کبھی بارش کے بعد اس شہر کی خوبصورتی کو چار چاند لگ جاتے تھے، اب یہ فکر رہتی ہے کہ کونسی سڑک زیر آب آ گئی ہے۔ یہ مسئلہ صرف اسلام آباد تک محدود نہیں بلکہ دیگر شہروں میں بھی یہی حالات ہیں۔ لاہور، کراچی اور راولپنڈی تو بارشوں میں وینس کا سماں پیش کرتے ہیں، جہاں لوگ گلی محلوں اور سڑکوں پر تیرنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ کیا ان سب کی وجہ موسمیاتی تبدیلی ہے؟ ہاں شاید کسی حد تک۔ مگر ان سب میں ایک اور پہلو یہ ہے کہ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا ہے، ہمارے شہروں میں بنیادی سہولیات کا ڈھانچہ بڑھتی ہوئی آبادی کو سنبھالنے میں ناکام ہوتا جا رہا ہے۔ شہری منصوبہ بندی کے نام پر کاغذات تو بھرے جاتے ہیں اور بلند و بالا دعوے بھی کیے جاتے ہیں مگر اسکا فقدان ہمیں عام نظر آتا ہے۔

http://news.xinhuanet.com/english2010/photo/2011-08/16/c_131053405_2.htm

۱۹۵۰ میں پاکستان کی ۵۰ فیصد آبادی دیہی علاقوں میں رہتی تھی ۔اس وقت شہروں میں آبادی پانچ کروڑ سے تجاوز کرگئی ہے۔ چند محتاط اندازوں کے مطابق آئندہ ۲۰ سالوں میں شہری آبادی ۱۲۰ فیصد تک بڑھ جائے گی اور شہروں میں ۱۳ کروڑ لوگ موجود ہوں گے ۔اس تمام صورتحال کو دیکھتے ہوئے ایک مایوس کن تصویر سامنے آتی ہے ، جہاں آبادی کے اضافے ، بے ہنگم یا خلاف ضوابط تعمیرات اور سہولیات کا فقدان پاکستان کے شہروں کو اجاڑ کر رکھ دیں گے ۔شہری منصوبہ بندی کے فقدان کی وجہ سے نہ صرف شہریوں کو مشکلات پیش آرہی ہیں بلکہ قیمتی جانوں کا ضیاع بھی معمول بن گیا ہے۔اس سال صرف اگست کے مہینے میں ہونے والی بارشوں سے بڑے بڑے شہروں میں جان و مال کا نقصان ہوا۔صرف کراچی میں اگست کے پہلے ہفتے میں بارشوں کے نتیجے میں آنے والے سیلاب سے ۱۷ قیمتی جانیں ضائع ہوئیں ،اس کے علاوہ ناقص اور خلاف ضوابط تعمیرات کے منہدم ہونے سے ہلاکتوں کی خبر ایک معمول بن چکی ہے۔

کراچی پاکستان کا سب سے بڑا شہر ہے جس کا رقبہ ۳۵۰۰ مربع کلومیٹر اور آبادی ۲ کروڑ سے تجاوز کرگئی ہے۔شہر میں لینڈ مافیا اور قبضہ مافیا عام ہے، **جس کا ثبوت حکومتی زمینوں ،نالوں اور پارکوں پر خلاف قانون ذاتی و کاروباری تعمیرات سے لگایا جا سکتا ہے۔یہ خلاف قانون آبادیاں نا صرف بنیادی سہولیات سے محروم ہیں بلکہ کسی بھی ناگہانی آفت کی صورت میں یہ آبادیاں سب سے پہلا شکار ہوتی ہیں۔غیر قانونی تعمیرات باقی شہر کے لئے بھی وبال جان بن سکتی ہیں ،جہاں ٹریفک کے مسائل اور پانی کی نکاسی کا مسئلہ سامنے آتا ہے ،اس کے علاوہ ماحولیاتی آلودگی بھی کراچی کا حصہ بن چکی ہے ۔** حکومت ان خلاف قانون تعمیرات کو روکنے میں ناکام رہی ہے، بلکہ بدعنوانی کی وجہ سے ان کی سرپرستی بھی کر رہی ہے۔ جہاں غیر قانونی آبادیاں شہری انتظامی ڈھانچے پر بوجھ ہیں، وہاں یہ جرائم کی پناہگاہ بن چکی ہیں ۔جرائم پیشہ افراد انہی علاقوں میں زیادہ سرگرم رہتے ہیں۔حکومتی بے حسی کو دیکھتے ہوئے شہری تنظیمیں اب آگے بڑھ کر ان مسائل سے نبرد آزما ہو رہی ہیں ۔ان میں سے ایک تنظیم "شہری" ماحولیاتی آلودگی ، غیر قانونی اور خلاف ضابطہ تعمیرات پر آواز اٹھاتی ہے۔یہ تنظیم عدالتی چارہ جوئی ،شہریوں میں آگہی پھیلا کر اور انتظامیہ کو ساتھ لے کر کراچی شہر کو بچا رہی ہے۔

اسلام آباد جو کہ ملک کا دارالخلافہ ہے،اس میں بھی صورتحال زیادہ حوصلہ افزاء نہیں ہے۔شہر کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ساتھ ساتھ غیر قانونی تعمیرات اور کچی آبادیاں بھی بڑھ رہی ہیں ۔جو شہر اپنے سبزے کی وجہ سے مشہور تھا، اب آہستہ آہستہ اپنی خوبصورتی کھوتا جا رہا ہے۔درخت اور جنگلوں کی جگہ اب انڈر پاس اور اوور ہیڈ برجز نے لے لی ہے،شاید بڑھتی ہوئی ٹریفک کے لئے سڑکیں اور انڈر پاس اب ناگزیر ہو چکے ہیں اگر حسب ضرورت بنائے جائیں ۔ابھی یہ خبر بھی گردش میں ہے کہ اسلام آباد کے نئے ائیر پورٹ کی لنک روڈ پر ۸ ارب روپے خرچ کئے جائیں گے۔جبکہ موجودہ سڑک کو کشادہ کر کے نہ صرف قومی خزانے کی رقم بچائی جا سکتی ہے بلکہ ماحول پر منفی اثرات کو بھی کم کیا جا سکتا ہے۔جنگل کی کٹائی سے جہاں شہر میں آلودگی بڑھی ہے وہاں پانی کی نکاسی میں بھی مشکل ہو رہی ہے۔جولائی ۲۰۰۱ میں نالہ لئی میں آنے والے سیلاب کو کون بھول سکتا ہے،جس سے راولپنڈی اور اسلام آباد میں ۳۰۰۰ مکانات تباہ ہوئے اور ۷۴ قیمتی جانیں ضائع ہوئیں ۔گرین بیلٹ پر غیر قانونی تعمیرات سے جنگلات ناپید ہو رہے ہیں۔

راول ڈیم سے منسلک آبادیوں کا کچرا اسی پانی میں جاتا ہے جو کہ لوگوں کے گھروں میں آتا ہے ۔نئی سے نئی ہاؤسنگ سوسائٹیاں تعمیر کی جا رہی ہیں،جن میں بحریہ ٹاؤن اور ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی سرفہرست ہیں ۔انہوں نے راول ڈیم کے نعم البدل کے طور پر ایک تجویز کردہ ڈیم کی زمین کو بھی اپنے احاطہ میں لے لیا ہے۔اسلام آباد کا حال دیکھ لیں جہاں کچھ سیکٹر مثلاً ای ۱۱ کی ناقص تعمیر کی وجہ سے کیپیٹل ڈیولپمنٹ اتھارٹی اسے اپنی تحویل میں نہیں لے رہا۔جو زرعی زمین اسلام آباد کی خوراک کی ضروریات فراہم کرنے کے لئے مختص تھی وہاں اب اشرافیات کے گھر بن چکے ہیں ۔کچھ عرصہ پہلے مارگلہ کی پہاڑیوں میں ایک سرنگ ایبٹ آباد تک بنانے کی تجویز بھی زیر غور تھی، جو شہریوں کی مزاحمت پر منسوخ کر دیا گیا۔اسی طرح جب اسلام آباد انتظامیہ نے ایک پبلک پارک کو منی گالف میں تبدیل کرنے کی کوشش کی تو اس اقدام کے خلاف شہری تنظیمیں

عدالت تک پہنچ گئیں۔اس مقدمے کا فیصلہ شہریوں کے حق میں ہوا اور عدالت نے انتظامیہ کو اس منصوبہ پر عمل درآمد سے روک دیا۔

موجودہ قوانین، زوننگ اور تعمیراتی ضابطے شہروں کے پھیلاؤ کو روکنے میں ناکام رہی ہیں جس کی وجہ سے قیمتی زرعی زمین بھی ضائع ہو رہی ہے۔حکومتی اور انتظامی امور کی ناکامی اور بے حسی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام آباد کی شہری منصوبہ بندی کے لئے تین ادارے موجود ہیں، کیپیٹل ڈیولپمنٹ اتھارٹی، اسلام آباد کیپیٹل ٹیریٹوری اور کیپیٹل ایڈمنسٹریشن اینڈ ڈویلپمنٹ ڈویژن، تینوں مفادات کی جنگ میں مصروف ہیں۔اتنے سارے ادارے جب ایک ہی مقصد کے لئے بنائے جائیں تو ان کے درمیان ہم آہنگی بھی بہت ضروری ہے۔حکومتی انتظامی امور کی ناکامی کا اندازہ اس بات سے لگالیں کہ ان تینوں اداروں کے درمیان نظم وضبط قائم رکھنے کے لئے کوئی اقدام ابھی تک سامنے نہیں آیا۔اس صورتحال میں یہ ادارے قومی خزانے پر بوجھ بنتے جارہے ہیں۔جہاں تک ماحول پر مضر اثرات کی بات ہے تو یہ صاف ظاہر ہے کہ انوائرمنٹ پروٹیکشن ایجنسی کے ضابطے شہری منصوبہ بندی سے نظرانداز کردیئے گئے ہیں۔کسی بھی شہر میں کچرا تلف کرنے کا کوئی مناسب انتظام نہیں ہے جبکہ اندرون شہر بھی اب انڈسٹریاں اور فیکٹریاں قائم کی جارہی ہیں۔

سول سوسائٹی اور شہری تنظیمیں بارہا ان مسائل پر آواز اٹھا چکی ہیں، مگر بڑھتی ہوئی آبادی، شہری نقل مکانی، بدعنوانی، قبضہ مافیا اور حکومتی بے حسی کے آگے سب بے بس نظر آتے ہیں۔قانون کے نفاذ میں کوتاہی اس بڑھتے ہوئے مسئلے میں نمایاں ہے۔وہ ادارے جو تعمیراتی کاموں پر نظر رکھنے کے لئے بنائے گئے تھے وہ بدانتظامی اور بدعنوانی کا شکار ہیں۔اس کے علاوہ شہری سہولیاتی ڈھانچے کو مضبوط کرنے کی بجائے پرانے اور بوسیدہ نظام پر بوجھ ڈالا جارہا ہے۔اگر پاکستان کے شہروں کو بگڑنے سے بچانا ہے تو شہریوں اور حکومت کو مل کر اقدامات کرنے پڑیں گے۔شہریوں کو چاہیئے کہ وہ حکومتی اداروں کے سامنے ان مسائل کو اجاگر کریں جس کے لئے میڈیا کی خدمات بھی حاصل کی جاسکتی ہیں۔شہری عدالتوں سے رجوع کرکے اور قانونی چارہ جوئی کے ذریعے اداروں کو حرکت میں آنے پر مجبور کرسکتے ہیں۔وسیع تر منصوبہ بندی کے تحت ان شہروں کو آباد کرنے اور بنیادی ڈھانچے کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے ورنہ کہیں یہ شہر جو کہ پاکستان کی زینت ہیں اندر سے منہدم نہ ہوجائیں۔

شہری تنظیموں، منصوبہ بندی اور انتظامی اداروں کے رابطہ ٹیلیفون نمبرز:

شہری سیٹیزن فار بیٹر انوائرمنٹ
+92(021)34530646,34382298

پائیدار (پاکستان انسٹیٹیوٹ فار انوائرمنٹ ڈویلپمنٹ ایکشن ریسرچ)
+92 (51) 2820359

پاکستان انوائرمنٹ پروٹیکشن ایجنسی
ڈائریکٹر جنرل
+92 (51) 9267621

ڈائریکٹر لیگل انفورسمنٹ
+92 (51) 9267632

لاہور ڈویلپمنٹ اتھارٹی
+92 (42) 111-111-532

راولپنڈی ڈویلپمنٹ اتھارٹی
+92 (51) 5555490-2

دی اربن یونٹ (حکومت پنجاب)
+92 (42) 99205316-22

کیپیٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی
چیئرمین
+92 (51) 9253001

ڈی جی سوک مینیجمنٹ
+92 (51) 92032216

ڈی ڈی جی میونسپل ایڈمنسٹریشن
+92 (51) 9252838

مصنف انڈوبجوئل لینڈ پاکستان میں ایک ڈیولپمنٹ پریکٹیشنر کی حیثیت سے کام کررہے ہیں۔

تُکا لگاؤ

ذوالفقار حیدر

http://tribune.com.pk/story/529136/get-ready-for-mornings-with-maya-khan/

روزے دار و تکا لگاؤ۔ ہم میں سے بہت سے دوستوں نے رمضان کے مہینے میں اپنی اپنی ٹی وی اسکرینوں پر سب کے پیارے عامر بھائی کو یہ جملہ دہراتے سنا ہی ہو گا۔ آخر ایسا کیا تھا جس کے لئے عامر لیاقت حسین صاحب بیچارے روزے داروں کو تُکے لگانے کو کہہ رہے تھے؟ ارے عامر بھائی ہم نے تو بچپن سے سن رکھا ہے کہ روزے کی حالت میں فضول اور بے جا بات چیت سے گریز کرنا چاہیے تو پھر آپ جیسا عالم فاضل شخص لوگوں کو کیوں کر ایسے مشورے دے رہا تھا؟

میری چھوٹی عقل میں تو یہ بات نا آئی کہ آخر ایسا کیوں ہوا، تو پھر ایک دوست نے کہا کہ ارے بھائی یہ سب پیسے کا کھیل ہے، پیسہ پھینک تماشہ دیکھ۔ تُکے لگاتے جاؤ اور فریج، ٹی وی، مائیکرو ویو اور حتی کہ بچہ بھی انعام میں لے جاؤ۔ یہ آخری بات سن کر میری تو ہوائیاں ہی اُڑ گئیں کہ آخر بچہ انعام میں کیسے مل سکتا ہے؟ تو پھر اُسی دوست نے کہا کہ یار تو جو دیکھتا ہے اُسے سچ سمجھ بیٹھتا ہے، یقیناً اُس ٹی وی شو کے دوران ایک بے اولاد جوڑے کو ایک دو ہفتے کی بچی دی گئی مگر وہ کسی سوال کے جواب میں نہیں دی گئی۔ چھیپا صاحب جوایدھی کے طرز پر ایک فلاحی ادارہ چلا رہے ہیں وہ اس شادی شدہ جوڑے سے کافی عرصے سے واقف تھے اور جب انہیں یہ لاوارث بچی ملی تو انہوں نے اس جوڑے سے ضروری جانچ پڑتال کے بعد یہ بچی ان کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا۔ یقیناً ہر دیکھنے والے کو یہی لگا ہو گا کہ شاید یہ بچی انعام کے طور پر دی گئی ہو گی۔ یقیناً ایسا نہیں ہوا، ہاں البتہ یہ ساری کاروائی اس شو کے دوران کی گئی۔

میں نے اپنی حیرت کو پس پشت رکھتے ہوئے اپنے دوست سے ایک اور سوال پوچھ ڈالا۔ یار مگر ایک مذہبی پروگرام میں یہ سب تماشہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ مذہب تو ہر کسی کا ذاتی مسئلہ ہے۔ یہ دولہوں کی طرح سجے ہوئے مولانا حضرات، یہ سرسبز گھاس پر چلتے ہوئے چرند پرند اور سانپ، آخر اس سب کی کیا ضرورت ہے؟ میری اس سادگی پر میرا دوست پھر سے ہنس پڑا اور بولا کہ یار ٹی

آر پی (TRP) بھی آخر کسی بَلا کا نام ہے اور آجکل سب میڈیا والے اسی بَلا کے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور اس سے پہلے کہ تو پھر سے کوئی انوکھا سوال کرے میں یہ بتا تا چلوں کہ ٹی آر پی کا مطلب ٹیلی وژن ریٹنگ پوائنٹس ہے ۔ یہ پوائنٹس ہمارے ٹی وی پر چلنے والے کسی بھی پروگرام کی مقبولیت کا پیمانہ ہیں تو در اصل عامر بھائی پورے رمضان میں روزانہ سات گھنٹے مذہب کے نام پر جو یہ سب کچھ کر رہے ہوتے تھے تو وہ انہی ٹیلی وژن ریٹنگ پوائنٹس کیلئے تھا۔ عامر بھائی کی شخصیت کا ایک رُخ تو ہم سب دیکھ ہی چکے ہیں۔ کسی بھی ٹی وی چینل کو اس سے کوئی سروکار نہیں کہ کوئی شخص اصل میں کیسا ہے۔ جب تک وہ اُس چینل کو پیسے بنا کر دے رہا ہے، وہ ٹی وی پر نظر آتا رہے گا۔ اور رہی بات مذہب کی تو میرے بھائی آجکل ہر چیز بکتی ہے اور مذہب کو ہمارے مولانا حضرات ایک عرصہ دراز سے بیچ رہے ہیں، ہاں البتہ یہ جو طرز عامر بھائی نے اپنایا ہے یہ ہم سب کے لئے نیا ہے۔

اور یہ صرف عامر لیاقت حسین ہی نہیں تھے بلکہ مایہ خان جیسی بلند و بالا شخصیت بھی اسی ٹی آر پی کی خاطر مذہب کی دُوکان کھولے بیٹھی تھیں۔ مایہ خان کی شخصیت سے بھی ہم سب واقف ہی ہیں۔ اپنے کیمرہ مین کو ساتھ لئے، ہاتھ میں مائیک پکڑے پارک میں بیٹھے جوڑوں کے پیچھے بھاگنے والی شخصیت کو آخر کون بھول سکتا ہے؟ مایہ کو اس حرکت پر عوام سے بہت کچھ سننا پڑا اور اس کے نتیجے میں انہوں نے سب سے معافی بھی مانگی مگر چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نا جائے۔ چند دن کی تاخیر کے بعد وہ پھر سے وہی دوکان سجائے ٹی وی پر نظر آنے لگیں۔ کبھی کالا جادو، کبھی جِنات اور کبھی کسی کے ماتھے پر اور کبھی روٹی پر خدا کا نام لکھا ہوا دکھانا شروع کر دیا، لوگ بھی بھول گئے اور پھر سے وہی ٹی آر پی کا تعاقب شروع ہو گیا۔ آجکل محترمہ غریب غرباء کی شادیاں کرواتی ہیں۔ مگر میں معافی چاہتا ہوں، کم از کم میں تو ٹی آر پی کی خاطر رچائے جانے والے اس ڈھونگ کو نہیں مانتا۔

میرے دوست نے میری معلومات میں مزید اضافہ کرنا شروع کیا اور میں بھی چُپ چاپ اس کی گفتگو سنتا رہا۔ اس نے مزید بتایا کہ مذہب کی یہ تجارت آج سے نہیں کئی سالوں سے جاری ہے۔ قصور ہمارا بھی ہے کہ ہم نے اپنی کم عقلی کے باعث ان نام نہاد ٹی وی اینکرز اور مولانا حضرات کو اپنی مذہبی ذمہ داریاں سونپ رکھی ہیں۔ ہم ان پروگراموں کی ریٹنگ خود بڑھاتے ہیں اور جب یہ ڈرامہ برداشت سے باہر ہو جاتا ہے تو شور مچانا شروع کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ ہماری ٹی وی اسکرینوں پر مذہب کی تجارت میں مصروفِ عمل نظر آتے ہیں۔ اور یہ کام صرف ٹی وی تک محدود نہیں، انٹرنیٹ پر بھی یہ کاروبار زور وشور

سے جاری ہے۔آپ نے اکثر ہی قرآنی آیات، خدا کے صفاتی نام اور احادیث کو خود بھی شیئر اور لائق کیا ہوگا اور اپنے دوستوں سے ایسا کرنے کو کہا ہوگا اور اس کی ایک ہی وجہ ہوتی ہے کہ ایسی تصویروں کے ساتھ یہ بھی لکھا ہوتا ہے کہ اگر آپ یہ شیئر نہیں کریں گے تو شاید آپ کو کوئی نقصان اٹھانا پڑے یا پھر اگر آپ ایک سچے مسلمان ہیں تو اسے شیئر کریں۔اس سب سے یہ ظاہر ہے کہ ایسی تصویریں جو لوگ شیئر کرتے ہیں انہیں صرف زیادہ سے زیادہ لائقس سے مطلب ہوتا ہے نا کہ آپ کے اچھے مسلمان ہونے سے۔اور میں یہ بتانا بھی ضروری سمجھتا ہو کہ ایسے لوگ زیادہ سے زیادہ لائقس کے ذریعے پیسے بھی بناتے ہیں۔عید کے دنوں میں آپ کی خیرات اور صدقات حاصل کرنے کے لئے بینرز اور پوسٹرز بھی شہر کے ہر کونے میں آویزاں کیے جاتے ہیں۔

ایسے ادارے ان اشتہارات پر لاکھوں روپے خرچ کر دیتے ہیں۔آخر ایسا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ جس نے خیرات یا صدقہ دینا ہوگا وہ خود ہی دے دے گا۔مگر پھر وہی بات کہ جو نظر آتا ہے ویسا ہوتا نہیں۔اگر یہ ادارے لاکھوں لگاتے ہیں تو کروڑوں کماتے بھی ہیں۔یقیناً سب خیراتی ادارے ایسے نہیں۔اور تو اور ہم سے بعض لوگ بغیر سوچے سمجھے اپنے پیسے ایسے اداروں کو بھی دے دیتے ہیں جو کسی نا کسی طرح دہشتگردوں سے منسلک ہوتے ہیں اور کلعدم ہونے کے باوجود بھی ان کے اشتہارات جگہ جگہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔یہ ادارے نا صرف مذہب کا نام استعمال کر کے لوگوں سے پیسے بٹورتے ہیں بلکہ ان پیسوں کا ناجائز استعمال بھی کرتے ہیں۔اس لئے یہ ضروری ہے کہ ہم میں سے ہر کوئی اپنی خیرات اور صدقات ایسے اداروں کو دیں جو ان کا صحیح استعمال کریں۔

چند روز پہلے ایک انگریزی روزنامے میں ایک ایسی ہی خبر پڑھنے کا اتفاق ہوا۔خبر کچھ یوں تھی کہ گوجرانولہ سے تعلق رکھنے والے ایک مذہبی رہنما نے اپنا اثر ورسوخ استعمال کرتے ہوئے اپنے مریدوں کے ایک ارب سے زیادہ روپے ایک جعلی اسلامک بینک کی اسکیم میں لگوا دیے۔وہ تو اللہ بھلا کرے قومی احتساب بیورو والوں کا جنہوں نے نا صرف مولانا کو گرفتار کیا بلکے اس سے سارا پیسہ بھی نکلوالیا۔

پاکستان میں مذہب کا استعمال صرف پیسے اور شہرت کیلئے ہی نہیں ہوتا بلکہ جہاد کے نام پر ہمارے ملک میں جو دہشتگردی ہو رہی ہے اس کی ایک بڑی وجہ بھی مذہب کا غلط استعمال ہے۔قرآنی آیات اور احادیث کو بغیر سیاق وسباق کے بیان کر کے لوگوں کے سامنے مذہب کی ایک غلط تصویر پیش کی جاتی ہے، اسی لئے مغربی ممالک اسلام کو شدت پسندوں کا دین سمجھتے ہیں حالانکہ ایسا ہرگز نہیں۔میرے خیال میں پاکستانیوں کو سب سے زیادہ نقصان بھی دہشگردی سے ہی ہوا ہے۔افسوس تو اس بات کا ہے کہ ماضی کی بہت سی حکومتوں نے بھی مذہبی جماعتوں کے دباوء میں آکر تعلیمی نصاب میں ایسی تبدیلیاں کیں جن کا نقصان آج تک ہم اٹھا رہے ہیں۔

پاکستان نہایت کٹھن دور سے گزر رہا ہے۔یوں لگتا ہے کہ جیسے ہم پندرھویں صدی عیسوین کے یورپ میں چلے گئے ہیں جس میں بالکل آج کے پاکستان کی طرح مذہب کے نام پر عام عوام کو تنگ کیا جاتا تھا اور بادشاہوں، امراء اور مذہبی شخصیات نے مذہب کو حکومت کرنے کا ایک ذریعہ بنایا ہوا تھا۔

مذہب کی غلط تشریح نے نا صرف دہشتگردی جیسے مسائل کو جنم دیا ہے بلکہ اس بنیادی مسئلے نے ہمارے ملک کی معیشت سمیت ہر شعبے پر منفی اثرات مرتب کئے ہیں۔ہمارے ملک کا میڈیا عوام پر کافی اثر ورسوخ رکھتا ہے، مگر اس اثر ورسوخ کا غلط استعمال بہت سے نئے مسائل کو جنم دے سکتا ہے۔میڈیا کا کردار ایک واچ ڈاگ کا ہے اور عام الفاظ میں کہا جائے تو یہ کردار ایک ریفری کے کردار کی طرح ہے جو کھیل کے دوران موجود تو ہوتا ہے مگر اس میں حصہ نہیں لیتا بلکہ غلطی کرنے والوں کو ان کی غلطیوں سے آگاہ کرتا ہے اور کھیل کو جاری رکھتا ہے۔آخر میں میں مایہ خان، عامر لیاقت حسین اور دیگر شخصیات سے یہ درخواست کروں گا کہ مذہب سے لوگوں کی اصلاح ضرور کریں مگر اسے تفریح کا ذریعہ مت بنائیں کیونکہ پاکستانی عوام اب مذہب کے نام پر مزید استعمال نہیں ہونا چاہتے۔

مصنف انڈوبیجوئل لینڈ پاکستان میں سینیئر پروگرام مینیجر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

ییپ ایک سفر

فرحان خالد

۲۴ اضلاع، ۲۴۱ شرکاء اور ۲ ہزار سے زیادہ سامعین کی شرکت!

نہیں میں کسی کھیل یا آرٹ کے میلے کی بات نہیں کر رہا۔ درحقیقت یہ ایک ییپ نامی پروجیکٹ "امن کے نوجوان سفیر" کا ۲۰ لائنوں پر مشتمل خلاصہ ہے، جس کا آغاز اکتوبر ۲۰۱۲ء میں ہوا، اسکا مقصد پاکستان کے نوجوانوں کو ایک ایسا پلیٹ فارم مہیا کرنا تھا، جہاں وہ پاکستان میں موجودہ صورتحال کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار برملا اور بغیر خوف وخطر کرسکیں اور ملک میں موجود انتہا پسند سوچ کو تبدیل کرنے میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ توجہ صرف نوجوانوں تک ہی کیوں محدود رکھی گئی، اسکا جواب بہت ہی آسان ہے!

ترقی پذیر ممالک میں نوجوانوں کو بے انتہا چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر پاکستان کی بات کی جائے تو ہمیں دیگر ترقی پذیر ممالک سے زیادہ مشکلات ہیں۔ دیگر ترقی پذیر ممالک کی طرح ہمیں بھی گورننس، مہنگائی، بے روزگاری کے ساتھ ساتھ دہشتگردی کی لعنت جیسی مشکلات کا بھی سامنا ہے۔ موجودہ صورتحال میں (بجلی کے مسائل، افراطِ زر کی شرح کے علاوہ دہشتگردی) سے نہ صرف نوجوان مایوس ہورہے ہیں بلکہ ان کے غلط ہاتھوں میں آجانے کا بھی خطرہ ہے۔ دہشتگردی کے عنوانات پر مبنی تقریری مقابلے کی مدد سے نہ صرف نوجوانوں کو ان مسائل کی وجوہات تشخیص کرنے کے مواقع فراہم کیے گئے بلکہ ان کے پائیدار حل کی طرف بھی توجہ مرکوز کروائی گئی۔

ایک سال پر مبنی سرگرمیاں، کارکردگی کی بنیاد پہ ۲۴۱ شرکاء میں سے ۲۰ نوجوان کے سر پہ امن کے نوجوان سفیر کا تاج پھنایا گیا۔ ان بیس میں سے ۵ کو بڑے پیمانے پر امن کے سفیر منتخب کیاگیا، جن کو آئندہ امن کا پیغام پھیلانے کی سرگرمیوں میں مشغول کیا جائے گا۔ حصہ لینے والے نوجوانوں کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے، ایک ۱۳ اقساط پہ مشتمل حقیقت پر مبنی ٹیلی ویژن شو پروڈیوس کیا گیا جو کہ ٹیلی ویژن پر نشر کیا جارہا ہے۔ یقیناً ان ۵ لوگوں کے لیے بڑے پیمانے پہ امن کے سفیر منتخب ہونے کا یہ سفر آسان نہیں تھا۔ وہ چند ہفتوں کے لیے اپنے گھروں سے دور رہے، اعتماد کو بحال رکھتے ہوئے ہجوم کے سامنے پرفارم کرنا اور ملک کے مختلف حصوں میں سفر کرنا۔

تمام پاپرز کے بارے میں بتانا مشکل ہوجائے گا۔ ہم نے ۳"امن کے سفیروں" کے تجربات کو مرتب کیا ہے۔ چلئے ان "امن کے سفیروں" نے جن راستوں پر چل کر اپنی منزل پائی ان راہوں سے آپکو بھی آگاہ کرتے چلیں۔

سیدہ زینب نقوی: بازی گر

یہ لڑکی صحیح معنوں میں مقدر کی سکندر ٹھہری آیئے اس کے بارے میں اس ہی سے جانتے ہیں۔اس کا کہنا ہے کہ میری دوست نے مجھے یپ کے فارم کے بارے میں بتایا، ابتدا میں میں نے اس میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی اس خیال سے کہ اس سے میری تعلیم متاثر ہوسکتی ہے۔لیکن جب مجھے اس کے مرکزی خیال کا پتہ چلا تو میں نے اس میں حصہ لینے کا فیصلہ کرلیا۔ضلعی مقابلے میں تمام شرکاء فکرمند تھے کیونکہ ہمیں روسٹروم کے بغیر تقریر کرنی تھی۔میں بھی کچھ فکرمند تھی!

کیمرہ، لائٹس .....ایکشن، یہ سب میرے لیے نیا تھا۔جب پروگرام کے میزبان نے مجھ سے پروگرام کے نعرے کے بارے میں پوچھا تو میرا جواب نہ صرف میزبان کے لیے بلکہ میرے اپنے لیے بھی حیران کن تھا۔اور میرا جواب تھا...."امن، امن اور....امن" میزبان کے لیے یہ بہت حیران کن تھا کہ مجھے اس کا اندازہ ہی نہیں کہ یپ کیا ہے اور کس چیز کے متعلق ہے۔خیر اس نے خود ہی مجھے یپ کی ٹیگ لائن کا بتایا۔

اور پھر تقریر کا آغاز ہوا، میری تقریر کا عنوان تھا **"اب چپ رہنے کا فائدہ نہیں"** میں نے اپنی طرف سے بہترین تقریر کرنے کی کوشش کی لیکن تقریر کے اختتام پر میں نے ایک اور احمکانہ غلطی کی.....بجائے اس کے کہ میں یپ کی ٹیگ لائن جو کہ "زنجیریں توڑ مچا شور" اس کا نعرہ ہوا میں بلند کرتی، میں نے نعرہ تو لگایا مگر اس کا مطلب ہی بدل کے رکھ دیا میرا نعرہ تھا "زنجیریں توڑ منہ کھول"۔ اس نعرے کے ساتھ ہی قہقہے اور تالیوں کی آوازوں سے ہال گونج اٹھا۔میرے اس نئے نعرے کو نہ صرف تماشائیوں نے سراہا بلکہ ججوں کو بھی یہ بہت دلچسپ لگا لیکن بدقسمتی سے میں ایک نمبر کے فرق سے منتخب نہیں ہوسکی۔لیکن چند روز کے بعد پروگرام کے کوآرڈینٹر نے مجھے کال کی اور کہا کہ ایک منتخب نوجوان اپنا یہ سفر جاری نہیں رکھ سکتا جس کی وجہ سے اب آپ اس کی جگہ منتخب کرلی گئیں ہیں۔اس

کو کہتے ہیں قسمت۔

زینب کہتی ہیں کہ یہ سن کے مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا میں بہت خوش تھی اور میں نے اپنی اگلی تقریر کی تیاری شروع کر دی۔ خیبر پختونخواہ کے تمام شرکاء اپنے سربراہوں کی سرپرستی میں اسلام آباد کے لیے روانہ ہوئے۔ اگلے ہی دن ہم صوبائی راؤنڈ کے لیے "ایوانِ قائد" میں جمع ہوئے۔ اور ایک دفعہ پھر وہی ایک نمبر کا فرق میرے لیے بدقسمت ثابت ہوا۔ اور میں دوبارہ ہار گئی۔ جب میں گھر واپس آئی تو میری اس غیر متوقع ناکامی کی وجہ سے میں نے اپنی ماں کے آنکھوں میں جھلملاتے آنسو دیکھے۔ ایک دفعہ پھر مجھے کوارڈینیٹر نے فون کر کے بتایا کہ ایک پیپر کے حصہ نہ لینے کی وجہ سے میں مقابلے کے لئے منتخب ہو چکی ہوں، میں ہار کر بھی جیت گئی۔ اس ہار کے جیتنے والے کو ہی بازی گر کہتے ہیں۔ اور اس آخری موقعے سے فائدہ اٹھا کے اگر وہ واقعی بازی جیت جائے تو مقدر کا سکندر ہی کہلائے گا۔

زینب ایک دفع پھر مختلف اضلاع کے ۲۲ یاپرز کے درمیان تھی جو ٹریننگ کے لیے اسلام آباد میں ٹھہرے، اس کے خیال میں یہ یپ کے سفر کا بہترین حصہ تھا۔ مختلف لیکچر اور سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ جناب مبشر اکرام اور جناب شمعون ہاشمی کے لیکچر بھی بہت معلوماتی تھے۔ انہوں نے ہمیں تاریخ پڑھنے، ثقافت سے محبت کرنے اور سنی سنائی باتوں پہ یقین نہ کرنے کا درس دیا مزید یہ کہ ہمیں سچائی معلوم کرنے کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے۔

ہم نے بہت سی تاریخی مقامات کا دورہ کیا۔ لوک ورثہ کا دورہ میرے لیے پرلطف تھا۔ سیمی فائنل سے ایک دن قبل ہم یپ کی پروموشن کے لیے وڈیو گانے کی شوٹنگ کی ریکارڈنگ کے لیے گئے۔ ٹیم نے ہمارا بہت خیال رکھا۔ کیمرے کے پیچھے ڈائریکٹر کا ڈانس اور بہت سے نئے تجربات بھی ہمارے ساتھ رہے۔
گرینڈ فائنل کے دن ہمیں تقاریر کے عنوانات نہیں معلوم تھے اس لیے ان کو یاد کرنے کی فکر نہیں تھی۔ اس دن میں نے اپنے خاندان اور دوستوں کو مایوس نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور میں بہت پراعتماد تھی۔ اور میں جیت گئی۔

میں نے تمام تر کوشش کر کے آخر کار میدان مار ہی لیا۔ ایک جج کے الفاظ آج تک مجھے یاد ہیں "اور اب میں اس کو الیفائر کو بلانے جا رہا ہوں جس خود اس بات کا یقین نہیں ہوگا"..... میرا نام پکارا گیا، میں ایک لمحے کے لیے سکتے میں آ گئی۔ وہ میری زندگی کا حیرت انگیز لمحہ تھا۔ قسمت زینب پر دوسری مرتبہ مہربان ہوئی لیکن اس کو شاید اندازہ تھا کہ یہ لمحہ ہر دفعہ نہیں آئے گا اور اس نے میدان جیت لیا۔

ٹائٹل جیتنے کے بعد تماشائیوں میں سے کچھ نے مجھ سے آٹوگراف مانگا، یہ میری زندگی کا پہلا آٹوگراف تھا۔ میرے خاندان والے بہت خوش تھے۔ وہ دن میرے، میرے خاندان اور دوستوں کے لیے خوشیوں بھرا دن تھا۔ میں اپنے احساسات کو الفاظ مین بیان نہیں کر سکتی بس یہ ہی کہوں گی کہ میرے لیے وہ بہت تاریخی، شاندار اور خوبصورت لمحہ تھا۔

رضا علی ہاشمی: گلگت بلتستان کہاں؟

ناصرف ایک عظیم تجربہ بلکہ تمام سفر ہی بہت شاندار اور بہت عظیم تھا۔ میرے لیے مختلف ثقافتوں اور مختلف علاقوں کے لوگوں سے ملنے کا ایک شاندار موقع تھا۔ انڈو یجوئل لینڈ کی جانب سے عام عوام میں بیداری پیدا کرنے اور امن کو فروغ اور پاکستان بھر سے امن کے سفیر اکٹھے کرنے کی یہ ایک شاندار کوشش تھی۔

انہوں نے تمام صوبوں اور اسلام آباد سے تو یاپرز کو اکٹھا کیا لیکن میں یہ کہنا چاہوں گا کہ آپ نے گلگت بلتستان اور آزاد کشمیر جیسے دو اہم علاقوں سے لوگوں کو اکٹھا نہیں کیا۔ مجھے اس بات کا یقین ہے کی گلگت بلتستان میں بہت باصلاحیت لوگ ہیں اور ملک کی ترقی میں بہت اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے پارلیمنٹ میں ان کی کوئی نمائندگی نہیں ہے۔ انڈو یجوئل لینڈ جہاں فرد کی اہمیت ہے انہوں نے بھی ایک نظرانداز کیے جانے والے علاقے کو نظرانداز کر دیا۔

سیدہ میمونہ: ایک مشہور شخصیت

یہ بھی باقی دنوں کی طرح ایک عام دن تھا جب مجھے ایک فارم ملا، جی ہاں..... تقریری مقابلے کا فارم۔ میں نے فارم بھر کے واپس جمع کروا دیا یہی سوچتے ہوئے کہ یہ بھی دوسرے مقابلوں کی طرح کا ایک مقابلہ ہوگا۔لیکن میں یہ جانتی ہی نہیں تھی کہ یہ اتنا دلچسپ و پر لطف ہوگا۔

میری ۳ اور سہیلیاں بھی اس مقابلے میں حصہ لے رہیں تھیں اور ہم بہت خوش تھیں۔اس لیے نہیں کہ ہم نے بہت اچھی تقاریر لکھیں تھیں بلکہ اس لیے کہ ہم پرل کانٹینٹل ہوٹل میں ایک شاندار اور عظیم الشان استقبال کی امید کر رہے تھے۔ ہم وہاں پہنچے تو ۳ کیمرے، ایک شاندار اسٹیج ، میک اپ آرٹسٹ اور ایک خوبصورت میزبان ،ہم یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے۔تب ہمیں پتہ لگا کہ یہ ایک حقیقت پہ مبنی شو ہے، جس میں حصہ لے کر ہمیں " امن کے نوجوان سفیر " کا عنوان جیتنا ہے۔سٹیج پر جانے سے پہلے کے مراحل، انٹرویو، میک اپ، جج، تبصرے اور میزبان کے ساتھ ہماری باتیں ہمارا پہلا تجربہ تھا۔

"پاکستان میرا ایک خواب ہے " پہ پہلی تقریر کر کے میں ۵ سرِ فہرست لوگوں میں تھی جو اگلے راؤنڈ کے لیے منتخب ہو گئے تھے۔وقت گزر رہا تھا اور میں بے تابی سے اگلے راؤنڈ کا انتظار کر رہی تھی۔آخر وہ دن آ ہی گیا جب ہمیں اسلام آباد بلایا گیا۔ ہمارے اور ہمارے سربراہوں کے تمام تر اخراجات ادارہ اٹھا رہا تھا۔

صوبائی سطح کا راؤنڈ ضلعی راؤنڈ سے بھی بڑا تھا۔مختلف صوبوں سے لوگ اس راؤنڈ کے لیے اکٹھے ہوئے تھے۔لیکن تبھی ہمیں ایک مشکل کا سامنا کرنا پڑا جب تقریر سے چند لمحے پہلے اس کا دورانیہ ۵ منٹ سے کم کر کے ۳ منٹ کر دیا گیا۔

میری تقریر کا موضوع "میں ایک امید ہوں" تھا اور میری تقریر کے چند جملے یہ تھے:

میں ایک امید ہوں کیونکہ میں ایک ٹیکس ادا کرنے والی پاکستانی ہوں اور اپنے ملک کو اقتصادی طور پر خوشحال دیکھنا چاہتی ہوں۔

میں ایک امید ہوں کیونکہ میں ہر پاکستانی کو برابر سمجھتی ہوں چاہے وہ ایک عیسائی، یہودی، شیعہ یا سنی جو بھی ہو۔

میں ایک امید ہوں کیونکہ میں ایک نوجوان ہوں جو تعلیم چاہتا ہے چائلڈ لیبر نہیں۔

جب نتائج کا اعلان ہوا تو میں خیبر پختونخواہ صوبے میں پہلے نمبر پر تھی۔

تربیت کے ۱۰ بہترین دن گزارنے کے بعد سیمی فائنل کا دن آ گیا اور اب یہ وقت تھا جب ہم نے تیاری کیے بغیر اسی وقت عنوان دیے جانے پر تقریر کرنی تھی۔"میں برداشت نہیں بلکہ قبول کرتی ہوں" کے عنوان پر تقریر کر کے میں اللہ کے فضل و کرم سے منتخب ہو کے فائنل میں آ گئی۔

گرینڈ فائنل کا دن دلوں کی دھڑکنیں تیز اور جذبات سے بھرپور۔فائنل ۳ راؤنڈ پر مشتمل تھا۔ پہلے راؤنڈ میں ہمیں سٹیج پر تقریر کرنے جانا تھا جس کا دورانیہ ایک منٹ تھا۔میں نے اپنی تقریر میں دہشتگردی سے متاثرہ خیبر پختونخواہ اور لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں بات کی اور میرے لیے یہ حیران کن تھا کہ ججوں نے اسکو پسند کیا۔

دوسرا راؤنڈ اپنے آپ سے گفتگو کے متعلق اور تیسرے راؤنڈ میں آپکو ایک پارٹنر کے ساتھ ایک موضوع پر بات چیت کرنا تھی۔ مجھے اور مہوش گل کو سٹیج پر بلایا گیا، ہم نے خودکش دھماکوں، مذہب کے نام پر برین واشنگ، غیرت کے نام پر قتل اور عقائد پر بات کی۔ یہ پرفارمنس اتنی بہترین تھی کہ تمام ججوں اور تماشائیوں نے ہمیں کھڑے ہو کر داد دی۔

یہ وہ لمحہ تھا جب ہمارے دلوں کی دھڑکنیں کبھی رکتیں اور کبھی تیز ہو جاتیں جی ہاں یہ نتائج کے اعلان کا وقت تھا۔ میں پہلے نمبر پر تھی ۔ میں خدا کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔میرے آنسو نہیں تھمتے تھے۔اور جب مجھ سے آٹوگراف مانگے گئے تو میں خود کو ایک مشہور شخصیت محسوس کر رہی تھی۔

مصنف انڈو یجوئل لینڈ پاکستان میں پروگرام افسر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

تعلیم ایک حق یا فرض بھی؟

ریحان علی

پاکستان میں تعلیم کے مسائل ہمیشہ سے ہی سنگین رہے ہیں۔ کبھی یہ بات کی جاتی ہے کہ سرکاری تعلیم کا معیار بہت کم ہے، تو کہیں یہ کہا جاتا ہے کہ پرائیویٹ اداروں کی تعلیم بہت مہنگی ہے۔ اگر خواندگی کی شرح اور تعلیم کے لیے کیے جانے والے اقدامات پر نظر دوڑائیں تو آپکو اس بات کا اندازہ ہوگا کہ یہ تصدیق شدہ حقیقت ہے کہ ہم سنگین تعلیمی مسائل سے دوچار ہیں۔ ہم میں سے کچھ ایسے لوگ ہیں جو اس خوفناک اور قابلِ افسوس حقیقت کو تسلیم کر کے محض افسوس کر لیتے ہیں، لیکن کئی ایسے شہری بھی ہیں جو اس خوفناک حقیقت کو بدلنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

اس سے پہلے کہ میں ان ذمہ دار شہریوں کا ذکر کروں جنہوں نے پاکستان کی تعلیمی صورتحال کی بہتری کے لیے اقدامات کیے۔ میں پاکستان کی تعلیمی صورتحال آپکے سامنے پیش کرنا چاہوں گا۔ بدقسمتی سے پاکستان برصغیر کا واحد ملک ہے، جو تعلیم پر زیادہ توجہ مرکوز نہیں رکھ پایا، پاکستان میں خواندگی کی شرح ۵۷ فیصد جبکہ ہمسایہ ممالک میں سے انڈیا کی ۷۵ فیصد اور بنگلہ دیش کی ۹۱ فیصد ہے۔ ہماری حکومت نے تعلیم کا معیار بہتر بنانے پر کبھی بھی توجہ نہیں دی، ۲۰۰۶ سے ۲۰۰۷ میں تعلیم پر جی ڈی پی کا صرف ۲.۵ فیصد، ۲۰۰۷۔۲۰۰۸ میں ۲.۴۷ فیصد، ۲۰۰۸۔۲۰۰۹ میں ۲.۱ فیصد جبکہ ۲۰۰۹ء میں ۲ فیصد مختص کیا گیا۔ اگر ہم اس کا موازنہ برصغیر کے دوسرے ممالک سے کریں تو انڈیا جی ڈی پی کا ۳.۳ فیصد، نیپال ۳.۲ فیصد، ایران ۵.۲ فیصد جبکہ مالدیپ ۸.۳ فیصد خرچ کر رہا ہے۔ ۵ سے ۱۶ سال کے تقریباً ۲۵ ملین بچے سکول کی تعلیم سے محروم ہیں۔ یہ بجا ہے کہ تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنا ریاست کا فرض ہے جسکا وعدہ ہم سے پاکستان کے آئین میں آرٹیکل ۲۵ میں کیا گیا ہے۔ اس حق کو حاصل کرنے کے لیے شہری بھی ریاست کی مدد کر سکتے ہیں۔

تعلیم کی اس مایوس کن صورتحال کو دیکھتے ہوئے، حکومت نے موجودہ مالی سال کے بجٹ میں تعلیم کو اولین ترجیح دینے کا دعویٰ کیا ہے۔ گزشتہ سال کے بجٹ میں تعلیم کے لیے مختص کی گئی رقم میں ۱۸ فیصد اضافہ کیا گیا۔ گزشتہ سال میں کل اخراجات کو تقریباً ۱۹۵ ارب سے ۲۳۱ ارب تک بڑھایا گیا۔ خواندگی کی شرح کے لیے ۱.۶۰۵ ارب روپے مختص کیے گئے، اور غیر رسمی تعلیم کے بجٹ جو کہ ۰.۹۱۵ ارب تھا اس میں ۵۷ فیصد کا اضافہ کیا گیا۔ پرائمری، اعلیٰ اور خصوصی تعلیم کے لیے رواں مالی سال کا بجٹ گزشتہ سال سے زیادہ رکھا گیا ہے۔ ۱۳۔۲۰۱۲ کے بجٹ میں تعلیم کے لیے مختص کی گئی رقم ۲۵ فیصد تھی جو کہ اب صرف ایک فیصد کے اضافے کے ساتھ ۲۶ فیصد ہے۔

کیا یہ صرف حکومت کی ہی ذمہ داری ہے کہ وہ ہمیں سہولیات مہیا کرے؟ آخر ہم یہ ذمہ داری کیوں نہیں لے سکتے؟ ہم سرکاری سکولوں کو برا بھلا تو کہتے ہیں لیکن اگر ماضی میں جھانکیں تو ان ہی سکولوں کی کوکھ نے ایسے ایسے شاہکاروں کو جنم دیا ہے کہ ہم ہی لوگ سینا تان کر فخر سے ان کا نام لیتے ہیں۔ ہماری قسمت نے ہمیں اگر آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کیے ہیں تو ہمیں یہ احساس ہونا چاہیے کہ ایک فرد کی حیثیت سے ہماری سماجی ذمہ داریاں بھی ہیں؟ یہ حقیقت ہے اگر سب کچھ اچھا ہی رہے تو کوئی آگے بڑھنے کے مواقع کیونکر ڈھونڈے گا؟

تعلیم حاصل کرنا میرا حق ہے! یہ جملہ میں اکثر سنتا ہوں، لیکن میرا فرض کہاں شروع ہوتا ہے؟ میرا فرض یہ ہے کہ میں تعلیم کے حق کے لیے آواز اٹھاؤں، اگر میں اس کے لیے کچھ کر سکوں تو اپنا کردار ادا کروں۔ اور یہ بھی کہ اگر میری بیوی، بیٹی یا بہن پڑھی لکھی ہے اور وہ اس کے لیے کچھ کر سکتی ہے تو میں اس کو مواقع فراہم کروں۔ شاید ایک فیصد یا اس سے بھی کم لیکن ہمارے معاشرے میں ایسی خواتین بھی ہیں جو ڈاکٹری یا انجینئرنگ کی ڈگری تو لے لیتی ہیں لیکن ان کی زندگیاں گھر بار تک محدود رہتیں

ہیں۔ میں خواتین کی اس تعلیم کے خلاف نہیں لیکن ابھی یہ شعور اجاگر کرنا باقی ہے کہ ہماری ان خواتین کو عملی زندگی میں بھی اپنے ہنر کے لوہے منوانے کی اجازت دی جائے۔ اگر ملالہ جیسی بچی تعلیم کے لیے آواز بلند کرسکتی ہے اور اپنے اور ملک کی بیٹیوں کے اس حق کے لیے لڑسکتی ہے تو میں آپ یا ہماری بہنیں کیوں نہیں؟ ملالہ یوسف زئی نے تعلیم کے خاص طور پر لڑکیوں کی تعلیم کے فروغ کے لیے آواز بلند کرنے کی وجہ سے تعریف کی مستحق ہیں، اسکی وجہ سے ہی بہت سے خاندانوں میں یہ شعور اجاگر ہوا کہ وہ بھی اپنی بیٹیوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کریں۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہمارے معاشرے میں احساسِ ذمہ داری پروان چڑھ رہا ہے یہاں بہت سے ایسے لوگ ہیں جنہوں نے ملک کو تعلیمی طور پر مستحکم کرنے کے لیے بہت سے اقدامات کیے ہیں۔ ہمارے ہی درمیان سے چند افراد نے ایک تعلیمی مہم "الف اعلان" کا آغاز کیا۔ اس کا مقصد ان تمام پاکستانیوں کو متحد کرنا اور بااختیار بنانا تھا جو ملک میں تعلیم کی موجودہ صورتحال کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں، نہ صرف اپنی کامیابی بلکہ ملک کی تعلیمی ترقی کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ "الف اعلان" کے اس تعلیمی کارواں نے پاکستان کے ۱۴ اضلاع کا دورہ کیا، جہاں سے ایک بھاری اکثریت کا جواب ۵ سے ۱۶ سال کی عمر کے بچوں کے لیے مفت تعلیم کے حق میں تھا۔ الف اعلان تعلیمی کارواں نہ صرف تعلیم کے آئینی حق کے بارے میں بیداری پیدا کرے گا بلکہ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیئے داخلوں کے حصول کی معلومات بھی فراہم کرے گا۔ اس طرح کے اقدامات کو سول سوسائٹی، پنجاب حکومت اور سیاست دانوں نے بہت سراہا، اس کی وجہ سے تعلیم کی اہمیت کے بارے میں والدین پر بہت مثبت اثرات مرتب ہوئے۔ والدین نے اس سلسلے میں پیش قدمی کی اور بچوں کو سکول بھیجنے کی شرح میں اضافہ ہوا۔

اس کے علاوہ "شہزادرائے" جو ایک مشہور گلوکار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں ان کا نام بھی تعلیم کے لیے اہم اقدامات کرنے کے حوالے سے جانا جانے لگا۔ اس نے اپنے ہنر کو استعمال کر کے ملک کی تعلیمی ترقی میں اپنا حصہ ڈالا۔ اسی سلسلے میں ایک تنظیم "زندگی ٹرسٹ" کا قیام بھی کیا۔ یہ ادارہ ان بچوں کے لیے کام کر رہا ہے جو محنت مزدوری کر کے کچھ کما رہے ہیں، جن میں مکینک، دکانوں پر کام کرنے اور سڑکوں پر مختلف اشیاء بیچنے والے شامل ہیں۔ "زندگی ٹرسٹ" کے تعلیم کے لیے اٹھائے گئے اقدامات کو جتنا سراہا جائے کم ہے، ۲۱۰۰ سے زائد بچے جو ہمیں محنت مزدوری کرتے نظر آتے تھے انہوں نے اس سکول میں داخلہ لیا۔ اساتذہ بھی بہت قابل ہیں جو ان بچوں کو ان کی زندگیاں بنانے کے لیے اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

لیکن تعلیم کی دنیا میں تہلکا مچانے والے اس شخص نے یہیں تک جدوجہد نہیں کی بلکہ اس نے ایک اور انیشیٹو پر کام کیا جس میں اس نے ایک ٹیلی ویژن شو "چل پڑھا" پر میزبانی کے فرائض سرانجام دیتے ہوئے تعلیم کو فروغ دیا۔ اس شو میں سرکاری اداروں میں استعمال ہونے والی زبان کی خامیوں اور بچوں کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس بارے میں تھا۔ پاکستان میں بہت سے ایسے علاقے ہیں جہاں نہ تو انگریزی اور نہ ہی اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے، اس پروگرام کے ذریعے بچوں کو ان کی مادری زبان میں پڑھانے کی تجاویز پیش کی گئیں، جس سے ان کے لیے تعلیم آسان ہو جائے گی اور ان کو انگریزی اور اردو الگ زبان کے طور پر پڑھائی جائے۔

شہزاد رائے نے تقریباً ۲۰۰ سکولز کا احاطہ کیا جن کو، اساتذہ کی عدم موجودگی، وسائل کی کمی اور نصاب میں موجود مسائل کی وجہ سے توجہ کی ضرورت ہے۔ اساتذہ کی جانب سے دی جانے والی جسمانی سزا کے مسئلے کو بھی اجاگر کیا گیا، جو کہ بچوں کے سکول سے مایوسی اور گریزاں ہونے کو جنم دیتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ قومی اسمبلی پاکستان نے ایک بل پاس کیا جس میں تعلیمی اداروں میں جسمانی سزا پر پابندی لگاتے ہوئے، جو بھی اس جرم میں ملوث پایا گیا اس کو ۵۰ ہزار روپے جرمانہ اور ایک سال قید کی سزا سنائی جائے گی۔

شہزاد رائے نے پاکستان کے لیے جو کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہ سوچنے کی بات ہے کہ کوئی بھی فرد اپنی خداداد صلاحیتوں اور اپنے ہنر کو استعمال کر کے کیسے ملک کو معاشی، سیاسی، تعلیمی اور اقتصادی ترقی میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔

تعلیم کے ہی حوالے سے ایک اور قدم جو کہ "ایجوکیشن فنڈ فار سندھ" کے حوالے سے ہے۔ اس میں بھی تعلیمی واؤچرز دیے گئے۔ ۴ بہترین ساکھ رکھنے والے سکولوں کے لیے ۵، ۵ ہزار کے واؤچرز دیے گئے۔ اور نہایت ہی بہترین انداز سے اس کی نگرانی اور متوازن چیک رکھا گیا۔ مثال کے طور پر اگر کسی خاندان کے کسی بچے کو یہ واؤچر دیا جاتا تو اس کا تمام ڈیٹا اور تصاویر سکول کو مہیا کی جاتیں تاکہ اس میں بے ایمانی نہ ہو سکے۔ اسی طرح کے کئی اور اقدامات جو فرد یا افراد کی کوششوں کو اُجاگر کرتی ہیں۔ ایک اور سلسلے میں اٹھائے گئے اقدامات جو کہ ایک اور "تعلیمی واؤچر" سکیم ہے جو خاص طور پر صوبہ پنجاب میں شروع کی گئی، جس کا مقصد ان بچوں کو سہولیات فراہم کرنا تھا جن کے پاس محدود وسائل ہیں، اور جو مالی مشکلات کی وجہ سے تعلیم جاری رکھنے سے قاصر ہیں۔ اس سکیم کو معاشرے کے غریب طبقے پر اثرات مرتب کرنے کی وجہ سے بہت سراہا گیا۔

ہمارے صوبے خیبر پختونخواہ کی حکومت نے تعلیم کے لیے ۶۶ ارب روپے مختص کرنے کا اعلان کیا ہے، اور اس صوبے میں تعلیم کو اولین ترجیح کے طور پر رکھا گیا ہے۔ اس میں سکول کے کردار کو بہتر بنانے، اضافی فنڈ فراہم کر کے تعلیمی معیار کو بہتر بنانے کا بھی دعویٰ کیا گیا ہے۔ اس صوبے کی حکومت نے طبقاتی تعلیمی نظام کو ختم کر کے ایک ہی تعلیمی نظام متعارف کروانے کا منصوبہ بنایا ہے۔

صرف حکومتی اداروں کے کندھوں پر بوجھ ڈال دینا کافی نہیں۔ ہمارے ملک کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ سرکاری اور غیر سرکاری ادارے مل کر ملک کی ترقی کے لیے کام کریں۔ حکومت اگر کسی غیر سرکاری سکول کے اساتذہ کو معاوضہ دے کر ۵۰ بچوں کو کسی بھی اکیڈمی میں پڑھانے کے معاہدے کرے تو یہ بھی ایک طرح سے ایک بہت بڑا اقدام ثابت ہوگا۔

سرکاری اداروں کے علاوہ غیر سرکاری ادارے اور سماجی کارکنوں نے بھی تعلیم کی اہمیت کے فروغ اور بچوں کو سکول بھیجنے کے لیے بہت سے اقدامات کیے ہیں۔ ان اقدامات نے نہ صرف والدین پر سودمند اثرات مرتب کیے ہیں بلکہ حکومت نے بھی سماجی کارکنوں کی ان سرگرمیوں کو بہت سراہا ہے۔ اگر سرکاری اور غیر سرکاری ادارے مل کر تعلیم کے فروغ کے لیے کام کریں تو یہ صحتمند تعلیمی ماحول کو جنم دے گا، جس کا فائدہ نہ صرف معاشرے کو ہوگا بلکہ یہ ملک کی خوشحالی اور ترقی کا بھی ضامن ہے۔

مصنف انڈوبجوئل لینڈ پاکستان میں کمیونیکیشن افسر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

http://madonnasworldcom.blogspot.com/2012/05/smirnoff-madonna-facebook-banners.html

روشنی کی کرن

خرم سلیم

امریکی گلوکارہ، مصنفہ اور اداکارہ میڈونا نے اپنے آپ کو ایک پاپ آئیکون کی حیثیت سے منوایا۔ تیس سال کا عرصہ ہو گیا ہے۔ "مٹیریل گرل" اور "لا ایک اے ورجن" جیسے گانوں کو جن کی وجہ سے میڈونا آج بھی لوگوں کے دلوں میں بستی ہیں۔ ان کو جدید موسیقی کی سب سے با اثر خاتون سمجھا جاتا ہے۔ ان کی دو کروڑ سے زیادہ البمز دنیا بھر میں بک چکی ہیں اور ان کو بل بورڈ ہاٹ ۱۰۰ چارٹ کی سب سے کامیاب سولو آرٹسٹ مانا جاتا ہے۔ میڈونا کو ان کی جادوئی دھنوں کی وجہ سے جانا جاتا ہے لیکن اس بار ان کو سماجی کاموں کی وجہ سے سراہا جا رہا ہے۔ اس عظیم ہستی نے اپنی رے آف لاہٹ فاؤنڈیشن کے ذریعے افغانستان اور پاکستان میں لڑکیوں اور عورتوں کی تعلیم، صحت اور عورتوں کے انصاف میں مدد کرنے کا اعلان کیا۔ میڈونا سمجھتی ہیں کہ بدقستمی سے یہ مما لک پہلے سے غریب ہیں، جہاں روٹی کھانا مشکل ہے، وہاں تعلیمی ترجیح ممکن نہیں ہے۔ خاص طور پر افغانستان اور پاکستان میں جو دہشت گردی کے خلاف جنگ کے اثرات سے دوچار ہیں۔ آج بھی انسانیت دنیا میں موجود ہے اور وہ لوگ بہت خوش قسمت ہیں جن کو اپنی صلاحیت دکھانے کا موقع ملتا ہے۔ حال ہی میں میڈونا حمیرا ابچل کے ساتھ اسٹیج پر آ ہیں۔ حمیرا ابچل ایک نڈر پاکستانی لڑکی ہے جنھوں نے انتہائی مشکل حالات میں کراچی کی کچی آبادی میں رہنے والی لڑکیوں کو تعلیم حاصل کروائی۔ اپنی تقریر میں میڈونا نے تمام لوگوں کو اپنے ساتھ شامل ہونے کی دعوت دی تاکہ وہ مل کے دہشت گردی کا خاتمہ کر سکیں، امن کو پھیلائیں اور لڑکیوں کو تعلیم حاصل کرنے میں مدد کر سکیں۔ پچھلے سال میڈونا نے ایک گانا" من نیچر" ملالا یوسف زئی کو وقف کیا، جس کو طالبان نے گولی ماری تھی کیونکہ اس نے پاکستان کے شمالی علاقوں میں خواتین کی تعلیم کے لیے آواز اٹھائی۔ اس گلوکارہ نے تعلیم کی فروغ اور عورتوں کے حقوق کے لیے پر جوش نعرے لگائے جس کا لوگوں نے پر جوش جواب دیا۔ اس کے ساتھ انھوں نے ملالا کا نام بھی دکھایا جو انھوں نے اپنی کمر پر لکھا تھا، جس کا مقصد تھا تعلیم کو فروغ دینا۔

حوالہ : http://ichime.in/madonnahumaira

(حوالہ: http://allaboutmadonna.com/2013/07/instagram-madonna-on-pakistan-school-freedom.php)

میڈونا: ہم نے کر دیا۔ ہم مل کے ایک اسکول پاکستان میں بنا رہے ہیں۔ آپ نے پہلی منزل بنائی، باقی میں بناؤں گی۔ بہت شکریہ۔ ریولیوشن آف لو

http://www.zimbio.com/pictures/E45OJaiQ-dm/Fulham+v+Arsenal+Premier+League/MeR9njhfzbg/Shahid+Khan

بوم بوم ۱۱

خرم سلیم - سُندس سیدہ

میں ایک ایسے ملک کا شہری ہوں جو ترقی پذیر ہونے کے ساتھ ساتھ ترقی کی راہوں پر گامزن بھی ہے۔اس کی مٹی نے مجھے پروان چڑھایا ہے مجھے اس ملک سے پیار ہے۔ جس ملک کی مٹی سونا اگلتی ہو تو اس کے لعل بھی کسی ہیرے جواہرات سے کم نہیں ہوتے۔ وہ دنیا کے کسی بھی کونے میں چلے جائیں ان کے ہاتھ میں سبز پاسپورٹ ان کی پہچان ہے کہ وہ اس ملک کے باشندے ہیں جو وسائل کی دولت سے مالا مال ہے۔اس پاسپورٹ جیسے گرگٹ کو اپنا رنگ بدلنے میں وقت نہیں لگتا لیکن اس کو جنم دینے والی گود وہی رہتی ہے۔اسی طرح پاکستانی کہیں بھی چلے جائیں ان کی پہچان ان کا پاکستان ہی رہے گا۔

جب پاکستان کی پہچان کی بات آتی ہے تو کبھی ہم اس کی پہچان بن جاتے ہیں تو کبھی یہ ہماری۔ چاہے وسائل کے دوڑ ہو، تعلیم کی دنیا، فیشن کی دوڑ یا کھیل کا میدان۔ ہاکی ہمارا قومی کھیل تو ہے ہی لیکن جو لگاؤ ہمیں کرکٹ سے ہے اور جو جنون ہمیں فٹبال نے دیا ہے اس کا لطف ہی کچھ اور ہے۔لیکن کیا آپ اور میں ان لوگوں سے واقف ہیں جو میدان میں نظر آتے ہیں یا ان سے بھی جو ان کو میدان مہیا کرتے ہیں۔ہمیں ان میدانوں کی ضرورت ہے جو ہمارے اپنے ہمارے نوجوانوں کے لیے ذرخیز کریں جن پر ہمارے نوجوان کھلاڑی سینا تان کے اپنے ہنر کا لوہا منوا سکیں۔کرکٹ کی طرح فٹبال بھی پاکستان میں بہت مقبول ہے۔لیکن بدقسمتی سے فٹبال ہمیشہ کرکٹ کی طرح وہ مقبولیت حاصل نہ کر سکا۔ فٹبال خاص طور پر پاکستان کے صوبہ بلوچستان میں جنوب مغربی علاقے اور بنیادی طور پر کراچی کے علاقے لیاری میں بہت مقبول ہے۔لیکن غربت اور ناقص سکیورٹی کی صورتحال ان کو بڑے پیمانے پر کھیلنے کے وسائل مہیا نہیں کر سکی۔

لیاری اور بلوچستان کے جنوب مغربی علاقے افسوسناک واقعات سے بھرے پڑے ہیں۔ ہمارے نوجوان اتنے تشدد پسند کیوں ہو گئے ہیں؟ آیئے ذرا اس واقعے پر نظر ڈالیے میرے ایک نوجوان فٹبالر بھائی پر کیا گزری انہی کی زبانی جان لیتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ میں "لیاری میں سکول کے سامنے سے گزر رہا تھا، لڑکیوں کے سکول کی چھٹی ہوئی کچھ لڑکے جو نشے میں تھے اور لڑکیوں کو تنگ کر رہے تھے، لڑکیاں شور مچا رہی تھیں۔ میں اور میرا دوست ان کو منع کرنے لگے لیکن انہوں نے گالیاں دیں اور ہمیں مارنا شروع کر دیا ہماری مذمت کرنے پر فائرنگ شروع کر دی ، مجھے پاؤں پر گولیاں لگیں۔ اور اس واقعے نے مجھے نا صرف

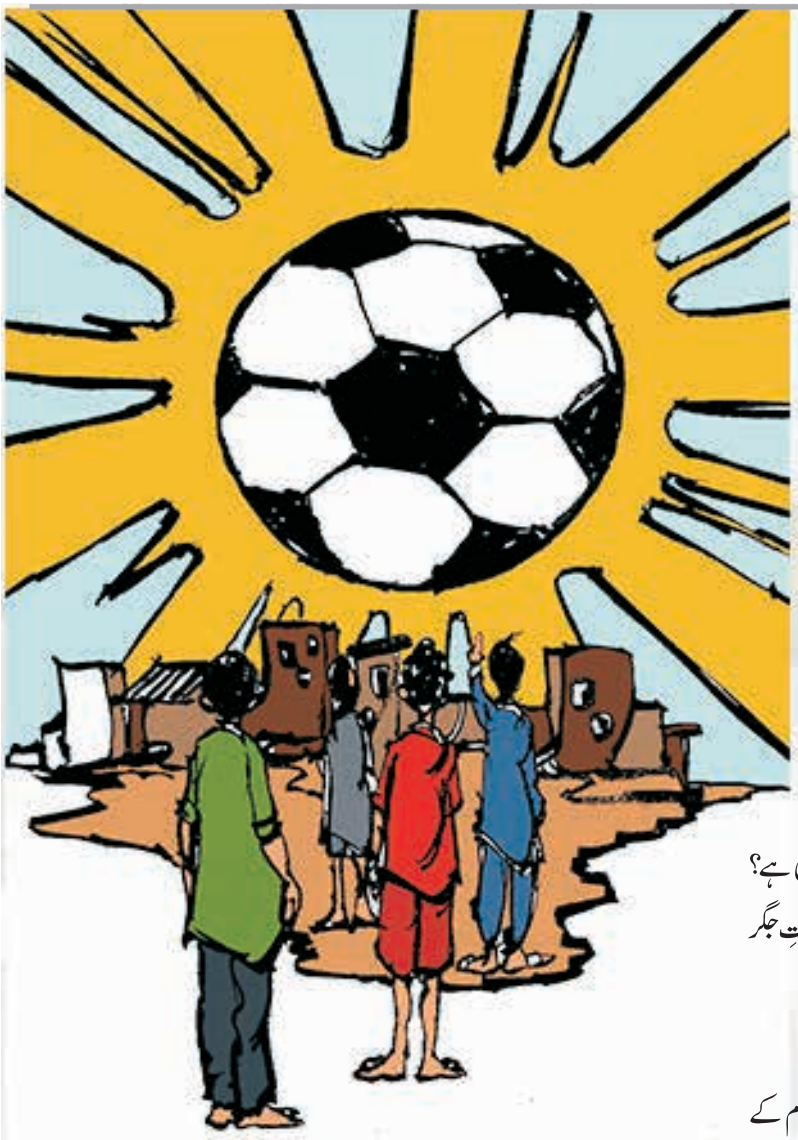

جسمانی بلکہ معاشی اور سماجی طور پر بھی معزور کر دیا ۔ میں پریس ڈپارٹمنٹ آف سندھ گورنمنٹ میں فٹبالر تھا، ڈسٹرکٹ ایسٹ میں بھی ۵ سال کیپٹن رہ چکا ہوں، کراچی کے بہترین کھلاڑیوں میں میرا شمار ہوتا تھا۔اب میں اسکول اور کالج کی طرف سے کھیل کے میڈل اور ٹرافیوں کی دھول بھی صاف کرنے کے قابل نہیں رہا"۔

ذرا ٹھہریے کچھ سال پیچھے چلتے ہیں۔ایک ایسا واقعہ جس نے کسی ایک ماں کی گود ہی خالی نہیں کی تھی بلکہ فٹبال کے میدان کو بھی ایک کھلاڑی سے محروم کر دیا۔

۱۱ اکتوبر ۲۰۰۷ء کراچی ائر پورٹ پر بے نظیر بھٹو کی پاکستان واپسی۔ ابھی تو یہ قافلہ ہوائی اڈے سے آدھا کلو میٹر کی دوری پر ہی تھا کہ....ایک زوردار دھماکے نے ہر طرف افراتفری پھیلا دی۔لوگ اپنی زندگیاں بچانے کے لیے بھاگ رہے تھے لیکن عبدالخالق....وہ کہاں ہے؟ کیا یہ واقعہ ایک اور کھلاڑی کو ہم سے جدا کر گیا تھا یا پھر کسی ماں کو اس کے لختِ جگر کے لئے تڑپا گیا؟

یہ نقصان یہ صدمہ اس کے گھر، گلی اور محلے کے لیے نہیں تھا بلکہ یہ ایک قوم کے لیے افسوس کی گھڑیاں تھیں۔ایک ایسا شخص ہم سے بچھڑا جس نے بحرین میں ۱۹۹۲ء۹۱ میں فٹبال ٹورنامنٹ کھیل کے پاکستان کا نام روشن کیا تھا۔اس نوجوان کو ملٹری اور پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز سے بھی نوکری کی پیشکش کی گئی لیکن وہ سندھ حکومت کے لیے اس کے پریس ڈپارٹمنٹ میں کام کرتا رہا۔
لیکن یہ نوجوان کراچی کے جس علاقے سے تعلق رکھتا تھا اس کے بارے میں آپ ہر روز سنتے ہی رہتے ہیں۔
لیکن ہم جو سنتے ہیں میں اس کا ذکر یہاں نہیں کرنا چاہوں گا۔جب لیاری جیسے علاقے کی گود میں پلنے والے نوجوان اس قدر صلاحیتوں کے مالک ہوں۔ جہاں کی گود نے فٹبالروں کو جنم تو دے دیا، لیکن کرم نہ دے سکی۔یہ صلاحیتیں ان کے جسموں کے ساتھ ہی مٹی میں ملتی گئیں۔کہیں سے کسی گولی کا نشانہ بنتے تو کہیں کسی دھماکے کی نظر ہو کر۔

یہ کھیل یہاں تک ہی محدود نہیں رہا....ارے میں اس خون کے کھیل کی بات نہیں کر رہا۔میں اس فٹبال کے کھیل کی بات کر رہا ہوں یہ لیاری کے علاقے تک محدود نہیں تھا یہ تو بلوچستان کے علاقوں میں بھی کھیلا جانے والا کھیل تھا۔لیکن پھر .....جہاں کے میدان میں فٹبال اچھلتے اور قہقہے گونجتے تھے اس کی جگہ لوگوں کے سر اچھالے جانے لگے قہقہوں کی جگہ یا تو سناٹا ہوتا یا کسی کے لٹنے پٹنے اور مرنے مارنے کی صدائیں گونج اٹھتیں۔

آج میں اس میدان کی بات کروں گا جو پاکستان میں تو نہیں ہے لیکن اس سے جڑی ہماری اپنائیت اسکو ہمارا بنا دیتی ہے۔کیا شاھد خان آفریدی کا نام کرکٹ کے میدان میں تھلکا مچانے والے نو جوان تک

ھی محدود ھے ؟ ھم شاھد خان آفریدی یا بوم بوم کے نام سے تو بھت اچھی طرح واقف ھیں جو کہ کرکٹ کے میدان میں بالروں کو مشکل میں ڈالنے کے لیے مشھور ھے۔ لیکن یہ آرٹیکل ایک اور شاھد خان کے بارے میں ھے جو ایک پاکستانی ھے اور اپنی خوشحال زندگی امریکہ میں گزار رھا ھے۔

حال ہی میں اس کا نام امریکہ کے ۴۰۰ امیر ترین لوگوں کی فہرست میں ۱۷۹ ویں نمبر پہ ہے ایک اندازے کے مطابق اس کی کل مالیت ۲.۵ ارب ڈالر ہے۔ مسٹر خان پاکستان کے شہر لاہور میں پیدا ہوئے، جب وہ ۱۶ سال کے تھے تو وہ ایلی نوائے میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے امریکہ منتقل ہو گئے۔ شاہد خان اس وقت مشہور ہوا جب اس نے اپنی دولت کو نیشنل فٹبال لیگ کی ٹیم جیکسن ویل جیگیوارز خریدنے کے لیے استعمال کیا۔ یہ نیشنل فٹبال لیگ کا پہلا غیر ملکی مالک ہے جس نے جیکسن ویل جیگیوارز کو ۲۰۱۲ء میں ۷۰ ملین ڈالر میں خریدا جو کہ اس وقت لیگ میں اٹھائیسویں نمبر پر ہے۔

ہم پاکستان کے بارے میں بری خبریں تو سنتے ہی رہتے ہیں، اور یہ تو کہا ہی جاتا ہے کہ پاکستان کے لوگ کرپٹ ہیں، پاکستان میں دہشتگرد ہیں اور یہاں کے حالات ٹھیک نہیں۔ میں آپ سے یہ سوال کرنا چاہوں گا کہ یہ حالات آخر کس نے پیدا کیے ہیں۔ ہم ہی تو ہیں جنہوں نے یہ معاشرہ بنایا ہے۔ اس معاشرے نے تو ہمیں نہیں بنایا لیکن پھر معاشرے کو قصوروار کیوں ٹھہراؤں؟

ارے ہاں! میں کسی پاکستان کے حوالے سے کسی اچھی خبر کی بات کر رہا تھا۔ جو ہمیں خوش قسمتی سے ہی سننے کو ملتی ہے۔ یہ خبر شاہد خان کے بارے میں تھی کہ وہ ایک مشہور فٹبال کلب جو کہ فلہیم فٹبال کلب (لندن) کے نام سے جانا جاتا ہے کا مالک بن گیا۔ پاکستان کے لوگوں کو دہشتگردی کے علاوہ کسی اچھے مقصد میں نام کماتے دیکھنا نہایت تسکین بخش ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ فٹبال دنیا کی مقبول ترین کھیلوں میں سے ایک ہے۔ لیکن پاکستان کے حالات آپکے سامنے ہیں کہیں ان کھلاڑیوں کے لیے میدان نہیں تو کہیں ان کے پاس وسائل نہیں۔ لیکن جب ہمارے ایک پاکستانی نے اپنی محنت کی کمائی ہوئی دولت سے فٹبال کے کھیل کے لیے کچھ کیا ہے تو میں اس بات کی امید کرتا ہوں کہ وہ ہمارے پاکستانی بھائیوں کے حالات کے ساتھ ساتھ ان کی صلاحیتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان کو بھی ترقی کے مواقع فراہم کریں گے۔ اور میں پرامید ہوں کہ اب جب فلہیم فٹبال کلب (لندن) کی ٹیم کھیلے گی تو یہ پاکستانیوں کے لیے بہت خوشی کا لمحہ ہوگا۔

اگر خان صاحب کی اجازت ہو تو کیا میں اس کو پاکستانیوں کے لیے ہوم گراؤنڈ کہہ لوں؟

یہ فٹبالرز کے لیے نہایت خوشی کی بات ہے کہ اب ایک پاکستانی، ایک مشہور پریمیئر لیگ کلب فلہیم کا مالک ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ مسٹر خان نوجوان پاکستانی فٹبال چیمپئنز کو نظر انداز نہیں کریں گے اور انکو فٹبال کے میدان میں اپنا لوہا منوانے کے مواقع فراہم کریں گے۔

مصنف انڈو یجوئل لینڈ پاکستان میں پروگرام افسر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

قدم بڑھاؤ: قدم جماؤ

ریحان علی

ہمارے نوجوان ملک وقوم کے لئے سرمایہ ہیں۔ یہ نوجوان معاشرے کی ترقی میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ وہ وقت اب نہیں رہا کہ ہمارے نوجوان اپنے پیروں پر کھڑے نہ ہوسکیں۔ باصلاحیت نوجوان زندگی کی ہر دوڑ میں آگے بڑھتے جارہے ہیں۔ یقیناً آج کے دور میں سب سے بڑا مسئلہ بے روزگاری ہے۔ کچھ نوجوان ایسے بھی ہیں جو دل ہار کے بیٹھ جاتے ہیں لیکن ہمارے ملک میں ان نوجوانوں کی بھی کمی نہیں جو کبھی پیچھے نہیں ہٹتے۔ آجکل بہت سے نوجوان نوکری کرنے کی بجائے کاروبار کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ایک شاندار کاروبار کا آغاز کرنا ایک محصور کن احساس ہے، لیکن اتار چڑھاؤ کے ادوار میں جو چیز ہمت بندھائے رکھتی ہے وہ آگے بڑھنے کی تڑپ، اور کچھ کر دکھانے کا عزم ہے۔

یہاں ہم ایک ایسے ہی نوجوان کا ذکر کرنے جارہے ہیں جنہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے اپنے کاروبار کو نئی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ عمر چودھری نے زرعی ترقیاتی یونیورسٹی سے کمپیوٹر سائنس میں گریجویشن کی ڈگری حاصل کی۔ کمپیوٹرز کے بارے میں پڑھنے اور اس کو سیکھتے سیکھتے ان کو نہ جانے کیا خیال آیا کہ اس نے کمپیوٹرز کو اپنی زندگی کا مقصد ہی بنالیا۔

ارے جناب رکیے! یہ بالکل بھی میری یا آپکی طرح فیس بک استعمال کرنے کی بات نہیں ہورہی۔ عمر کمپیوٹر سافٹ ویئرز کی دنیا میں آگے بڑھنے کا عزم رکھتے ہیں۔ آیئے جانتے ہیں کہ ایک انٹرنیشنل سافٹ ویئر کمپنی کے مالک اس نوجوان سے کہ انہوں نے اپنا مقصد کیسے حاصل کیا اور اس کی راہ میں کیا رکاوٹیں آئیں۔

سافٹ ویئر ھائوس گیٹ لوجکس کے مالک عمر نے ۲۰۰۹ء میں اپنے ایک دوست کی مدد سے اس کمپنی کی شروعات کیں۔ اسی دوران یہ دونو ں دوست ایک اور سافٹ ویئر کمپنی یونائیٹڈ سلوشنز میں ملازمت بھی کر رہے تھے۔ اپنے کالج کے ادوار میں ہی عمر کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ اس میں کاروبار کرنے کی صلاحیتیں ہیں۔ اس کا ذاتی مقصد نوجوانی میں ہی کچھ حاصل کر لینے کی لگن، اور بہت پیسہ کمانے کا جذبہ تھا۔

جب میں نے اس سے یہ پوچھا کہ وہ کاروبار اور نوکری میں کیسے توازن برقرار رکھتے تھے؟ تو عمر کا جواب تھا کہ اس نے اور اس کے دوست نے نوکری کے دوران یہ کاروبار شروع کیا اور شام کو نوکری کے بعد وہ اپنے کاروبار کو وقت دیتے ۔ اور اسی محنت کی وجہ سے جلد ہی ۳ ماہ میں وہ اپنے مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے تو انہوں نے ملازمت چھوڑ دی۔ عمر کے لیے یہ کاروبار ایک اتار چڑھاؤ کا سفر تھا۔ شروع میں ان کے پاس مناسب آفس بھی نہیں تھا۔ اس کے لیے انہوں نے یہ راہ نکالی کے تمام تر پبلک ڈیلنگ ایک دوست کے کال سنٹر میں ہوتی اور باقی کا کام کمپیوٹر پر۔

میرے اس سوال پر کہ یہ کام آپکے کے لئے کچھ مشکل تو نہیں ہوگا؟ عمر نے ہنستے ہوئے جواب دیا نہیں ایسی بات نہیں ہمیں بھی بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا

مثال کے طور پر ان کے لیے ایک بڑا چیلنج یہ تھا کہ انہوں نے جن ملازمین کو تربیت دی ہے وہ جلد ملازمت نہ چھوڑ دیں۔ کمپنی کے ساتھ معاہدے کے باوجود اکثر نوجوان اچھی آفرز کی وجہ سے کام چھوڑ جاتے تھے۔ یہ وہ دور تھا کہ مالی وسائل محدود ہونے اور کاروبار پر برے اثرات مرتب ہونے کی وجہ سے وہ ملازمین پر مقدمہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بھی ہماری طرح بجلی کے بحران کا شکار رہے، ان کا تمام کام کمپیوٹر اور بجلی کا محتاج تھا اس لیے ان کے لیے یہ بھی ایک مشکل مرحلہ تھا۔

آہستہ آہستہ عمر کی کمپنی ترقی کے زینے طے کرتی چلی گئی اور آج عمر کی کمپنی میں ۱۶ ملازمین ہیں، جن میں سے ۱۱ آپریشن ڈیپارٹمنٹ میں ہیں جبکہ موصوف خود اپنے مقصد کو ذہن میں رکھتے ہوئے دولت کے آس پاس ہی نظر آتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ وہ خود فنانس ڈیپارٹمنٹ میں ہیں۔ ان کے خیال میں مالک کو فنانس خود ہی سنبھالنا چاہیے، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اخراجات کو کنٹرول کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اب عمر اس کمپنی کے مالک ہیں، جس میں مختلف ڈیپارٹمنٹ موجود ہیں جیسا کہ انتظامیہ، ہیومن ریسورس، آپریشنز اور فنانس وغیرہ۔ عمر بہت پُر مسرت تھے کہ چند ہی ماہ میں وہ باقاعدہ سیلز، کاروباری اور کوالٹی انشورنس کے ڈیپارٹمٹ کا بھی آغاز کر دیں گے۔

عمر کے چہرے پر اور ان کی آواز میں خوشی محسوس کرتے ہوئے میں نے پوچھا کہ آپکے لیے سب سے پر مسرت لمحہ کون سا تھا؟ جس کے جواب میں عمر نے کہا کہ جب میں نے اپنی پہلی ادائیگی وصول کی تھی۔ شاید یہ اس پیسے کی چمک تھی یا اپنے خوابوں کو حقیقت میں بدلنے کی خوشی جو مجھے اس وقت عمر کے چہرے پر چھلکتی نظر آئی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ان کے زیادہ تر کلائنٹس انٹرنیشنل ہیں جن میں: ڈی این اے سلوشنز شامل ہیں جو ایک آسٹریلین کمپنی ہے اس کے ساتھ ڈیڑھ سال کا معاہدہ ہے اس کے علاوہ "اتصلات" یو اے ای ٹیلی کام کمپنی، اور چند انڈین کمپنیاں بھی ان کی کلائنٹس ہیں۔

عمر کے خیال میں آج بھی ان کے لیے سب سے بڑا چیلنج ملازمین کو کمپنی سے جوڑے رکھنا ہے، اس کے لیے انکو ملازمین کی مالی اور مختلف ضرورتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آفس میں دوستانہ اور کام کرنے کے لیے مناسب ماحول قائم رکھنا بھی ضروری ہے۔ عمر کے خیال میں ان کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اس کی کمپنی انٹرنیشنل لیول پر کام کر رہی ہے۔ مستقبل میں عمر اپنی کمپنی کو ملٹی نیشنل کمپنی بنانا چاہتے ہیں اور اسی سلسلے میں انہوں نے آسٹریلیا میں بھی ایک دفتر کھولا ہے جس کو انکا ایک تیسرا ساتھی سنبھال رہا ہے۔

عمر جیسے ہونہار نوجوان ہمارے ملک کے لیے قیمتی اثاثے سے کم نہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کی حوصلہ افضائی کے ساتھ ساتھ ان کو ہر طرح کا تحفظ بھی فراہم کریں تا کہ ان کی صلاحیتوں کو ملک کی معاشی ترقی کے لیے استعمال کیا جا سکے۔

مصنف انڈو یجوئل لینڈ پاکستان میں کمیونیکیشن افسر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

۲۰۱۴ء کا پاکستان

شمیم شاہد

وزیرِ اعظم نواز شریف نے ۹ ستمبر ۲۰۱۳ء کو آل پارٹیز کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ امریکہ ۲۰۱۴ء کے بعد بھی افغانستان میں رہے گا۔ وزیرِ اعظم نواز شریف کا یہ پیغام ان تمام لوگوں کے لیے ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ افغانستان کی حالت ۹۰ء کی دہائی کی طرح ہو جائے گی، اور امریکہ افغانستان سے چلا جائے گا۔ اسلام آباد میں موجود پالیسی میکرز کو اس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سوچنا پڑے گا۔

مہذب دنیا کے بڑھتے ہوئے دباؤ کی وجہ سے امریکی اتحادی قیادت پہلے ہی اپنی فوجوں کو افغانستان سے واپس بلانے کے لیے غور و فکر کر رہی ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ امریکی اتحادی قیادت افغانستان میں اپنی تکنیکی اور مالی امداد جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کی نظر میں وہ افغان حکومت اور فوج کو دہشتگردی سے نبٹنے کے لیے تیار کر رہے ہیں اور دوسری جانب جب افغانستان جو دنیا بھر کے مجرموں اور عسکریت پسندوں کے لیے ایک مضبوط پناہ گاہ بن گیا ہے، اس ۹۰ء کے دہائی جیسی صورتحال سے بچنے کے لیے اقدامات کر رہے ہیں۔

۹/۱۱ کے واقعے کے بعد جب امریکہ اپنے اتحادیوں کے ساتھ افغانستان میں داخل ہوا تو اس نے ۷ مختلف علاقوں میں اپنے مستقل محاذ تیار کر لیے۔ ان میں سے کم سے کم ۴ محاذ پاکستان کی سرحدوں کے ساتھ واقع ہیں، جن میں قندھار، پکتیا، ننگھار اور بدخشان ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امریکا کو پاکستان کی جانب سے زیادہ خطرات کا خدشہ ہے۔ پاکستان پہلے ہی اس تنقید کا نشانہ بھی بنا ہوا ہے کہ وہ امریکہ کے خلاف حملے کرنے والے عسکریت پسندوں اور افغان حکومت، عہدیداران، حکومت کے حامیوں اور افغانستان سرحد پار سیاست دانوں پر حملہ کرنے والے دہشتگردوں کی حمایت کرتا ہے۔ امریکہ کے یہ اقدامات ایسے ہی ہیں جو گریٹ گیم میں سابق سویت یونین کو توڑنے کے لیے اٹھائے گئے تھے، جب امریکا کو ویت نام میں شکست ہوئی تھی۔

تاہم اس بات کا اندازہ لگانا مشکل ہے کہ امریکہ اس خطے سے مکمل طور پر نکلے گا یا نہیں، لیکن پاکستان کی جانب سے اور عسکریت پسندوں کی جانب سے اس پر خاصا دباؤ ہے جو پہلے ہی امریکہ کی مزاحمت کرتے ہیں اور اعلانِ جہاد کیے بیٹھے ہیں۔ یہ سیاسی مذہبی حلقے بھارت کے افغانستان میں اثر و رسوخ کے بھی خلاف ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو ابتدا میں سابق سویت یونین کے خلاف مالی اور لاجسٹک کے ساتھ امریکی اتحادیوں کے ساتھ تھے، لیکن ۹/۱۱ کے سانحے کے بعد جب دہشتگردی کے خلاف جنگ کا اعلان ہوا تو یہ امریکہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔

امریکہ کی افغانستان سے مکمل واپسی کی صورت میں کشیدگی صرف ملک کی جغرافیائی سرحدوں تک محدود نہیں رہے گی، بلکہ ہمسایہ ممالک بھی اس کی لپیٹ میں آ جائیں گے خاص طور پر پاکستان جہاں پر عسکریت پسندوں کی جڑیں کافی مضبوط ہیں۔ پاکستان کے عسکریت پسند آپس میں متحد ہیں۔ پاکستانی عسکریت پسندوں کو تقریباً تمام مذہبی گروہوں کی حمایت حاصل ہے، مثال کے طور پر جمیعت علماء اسلام، جماعت اسلامی، اور جماعت اہلِ حدیث اور دیگر گروہ۔ ایسی ہم خیال سیاسی مذہبی گروہوں نے نہ ہی کبھی دہشتگردی کے خلاف اور نہ ہی شعیہ کے قتل کے خلاف آواز اٹھائی۔ یہ جماعتیں اور ان کے راہنما افغانستان کو آزاد خودمختار ریاست قبول کرنے سے گریزاں ہیں۔ انہوں نے نہ صرف غیر ملکی افواج کے خلاف بلکہ افغان حکومت کے خلاف بھی اعلانِ جنگ کیا ہوا ہے۔ اس میں وہ تمام شہری سیاست دان اور ملازمین ہیں جو جمہوریت، انسانی اور خواتین کے حقوق کی بات کرتے ہیں۔ اسی بنیاد پر ۹۰ کے دہائی کی صورتحال کے دوبارہ نمودار ہونے کے خطرات موجود ہیں، نہ صرف افغانستان بلکہ ہمسایہ ممالک کو بھی اپنی لپیٹ میں لے سکتے ہیں۔

چند عسکریت پسندوں سے ہمدردی رکھنے والے حلقے پاکستان میں موجودہ تشدد کی

صورتحال کو امریکہ کی افغانستان میں موجودگی کا سبب گردانتے ہیں، ان کے خیال میں پاکستان کے اقتصادی اور انتظامی مسائل کا خاتمہ امریکی اتحادیوں کے افغانستان چھوڑنے سے ہی ہوگا۔

لیکن یہ حلقے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں افغانستان کی موجودہ صورتحال ۹۰ ء کی دھائی سے بالکل مختلف ہو چکی ہے۔جب افغانستان جنگ سے تباہ حال ملک تھا یہاں پر تقریباً سیاسی اور سماجی طور پر با اثر شہری ملک میں جلا وطنی جیسی یا پھرپناہ گزینی کی زندگی گزار رہے تھے۔ اور یہ وہ وقت تھا جب ا فغانستان میں مناسب بنیادی سہولتیں میسر نہیں تھیں۔ لیکن موجودہ افغانستان قابل قبول آئین ، مقبول اور طاقتور پارلیمنٹ ، عدلیہ اور ایگزیکٹوز جیسے آزاد اداروں کا ملک بن چکا ہے۔ لاکھوں افغانی جن میں اثر و رسوخ رکھنے والے سیاست دان، تاجر، صنعتکار، دانشور اور کاروباری لوگ بھی شامل تھے جو واپس لوٹ چکے ہیں ۔ گزشتہ ۱۳ سالوں میں جنگ سے تباہ کار شہروں اور قصبوں کی دوبارہ تعمیر مغربی اور مہذب شہروں کی طرز پر ہو چکی ہے۔ غیر ملکی ڈونرز کے علاوہ مادرِ وطن افغانیوں نے بھی اربوں ڈالر کی سرمایہ کاری کی ہے اورشہریوں کے لیے سہولیات کو بہتر بنانے کی کوششیں جاری ہیں۔ گزشتہ ۱۳ سالوں میں ہونے والی سیاسی سمجھ

بوجہ کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اب اسلامی جہادی گروہ اور سابقہ سویت یونین کے حمایت یافتہ سوشل ڈیموکریٹس ایک دوسرے سے اتحاد اور دفاتر میں الحاق کر رہے ہیں۔

بعض افراد کی خواہشات اور کوششوں کے باوجود مختلف لسانی اور نسلی برادریوں کے لوگ متحد ہو چکے ہیں۔ یہاں تک کہ ایوانِ اقتدار تک پہنچنے کے لیے جو گروہ بنے ہیں وہ مختلف لسانی، نسلی اور فرقہ ورانہ گروہوں پر مشتمل ہیں۔ یہ افغان معاشرہ جوان کو احمد شاہ ابدالی سے وراثت میں ملا ہے اس کی وجہ سے ان کا آپس میں اٹوٹ بندھن بن چکا ہے۔ افغانستان کی تقسیم نسلی اور لسانی بنیادوں پر کوششیں کوئی نئی بات نہیں بلکہ یہ برطانوی نوآبادیاتی حکمرانوں کے دور سے چلی آ رہی ہے۔ انگریزوں سے لے کر امریکیوں تک تمام تر حملہ آوروں کے افغانیوں میں انتشار پھیلانے کے خواب ناکام رہے۔

عرصہِ دراز سے افغانستان سنی اکثریتی ریاست تصور کی جاتی ہے لیکن گزشتہ ۴ دہائیوں میں سعودی عقیدہ پرست اپنی بھاری سرمایہ کاری کی بدولت وہابیت کو اس ملک کے لوگوں میں داخل کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ افغانستان کی طرح پاکستان میں بھی یہی صورتحال ہے، جہاں بہت سے سیاسی مذہبی گروہ وہابیت (جو اہلحدیث کے نام سے بھی جانا جاتا ہے) سے متاثر ہو رہے ہیں۔ افغانستان سے امریکہ کی روانگی کی بدولت جو بھی تبدیلیاں ہونگی اس کے اثرات پاکستان پر لازمی ہوں گے۔

افغانستان کے مسئلے پر پاکستان جنوبی ایشیا کے خطے میں الگ ہی نظر آتا ہے۔ گزشتہ ڈکٹیٹر ضیاء الحق کی بنائی ہوئی سٹریٹیجک پالیسی نے ہمسایہ ملکوں خاص طور پر انڈیا، چائنہ اور ایران میں پاکستان کے امیج کو نقصان پہنچایا۔ حال ہی میں، بھارتی سفارت خانوں پر حملہ کیا گیا اور افغانستان میں چند شہریوں کو مار دیا گیا اور پاکستان کو موردِ الزام ٹھہرایا گیا۔ چین اپنے شہریوں کے معاملے میں جو وزیرستان میں عسکریت پسندوں کا حصہ بنے، اس میں پاکستان پر تشویش کا اظہار کرتا ہے۔ اور دوسری جانب نظر دوڑائیں تو افغانستان کی سرزمین پر ایران اور پاکستان عرصہ دراز سے پراکسی وار میں مصروف ہیں۔ امریکہ کا افغانستان سے چلے جانا پاکستان کے لیے پیچیدہ صورتحال پیدا کر سکتا ہے۔

امریکہ کے افغانستان سے چلے جانے کے بعد کی خلا پر کرنے کے بارے میں سوچنے کی بجائے، پاکستان کو بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ بجائے اس کے کہ ۹۰ء کی دہائی کے وسط کی طرح اپنے اثر و رسوخ کو بحال کیا جائے، جنگ سے تباہ ہمسایہ ملک کے استحکام اور امن کی بحالی کے لیے پاکستان کو مخلصانہ کوششیں کرنی چاہیں۔ افغانستان میں امن کی بحالی، تشدد اور خونریزی کا خاتمہ پاکستان کے انتظامی اور اقتصادی مسائل کا حل بن سکتا ہے۔ افغانستان کے ساتھ قابلِ اعتماد تعلقات قائم کر کے، پاکستان کے حکمران با آسانی وسطی ایشائی مارکیٹوں تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ وسطی ایشیائی ممالک میں موجود وسیع توانائی کے وسائل سے پاکستان کافی استفادہ حاصل کر سکتا ہے۔

حال ہی میں منعقد ہونے والی آل پارٹیز کانفرنس کی قراردادیں اور تجاویز پہلے سے مختلف نہیں ہیں۔ سیاست دان اور دانشوروں نے ۹/۱۱ سے شروع ہوئی دہشتگردی کی اس صورتحال جواب تک جاری ہے سے نمٹنے کے لیے پہلے جیسی ہی تجاویز پیش کی ہیں۔ افغانستان کے مسئلے میں سول اور فوجی بیوروکریسی کا آپس میں تناؤ ان سفارشات اور اعلانات میں عملی رکاوٹ کی بڑی وجہ ہے۔ جبکہ وزیراعظم نواز شریف اور جنرل کیانی اس مسئلے پر اتحاد کا دعویٰ کرتے ہیں جو خطے میں امن و سکون کی بحالی کے لیے امید کے خواہاں ہیں۔ لیکن تجاویز پر عمل درآمد، خاص طور پر کالعدم تنظیم تحریکِ طالبان پاکستان کے ساتھ مذاکرات میں احتیاط برتنی چاہیے۔ بعض اندرونی عناصر کے علاوہ ایک بڑی تعداد میں بیرونی طاقتیں اس خطے میں ابھی تک بحران اور تشدد کے فروغ میں مشغول ہیں۔ ان حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، امریکہ کے افغانستان سے چلے جانے کے بعد کے لیے بہترین حکمتِ عملی تیار ہو سکتی ہے۔

میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجیے:
info@individualland.com

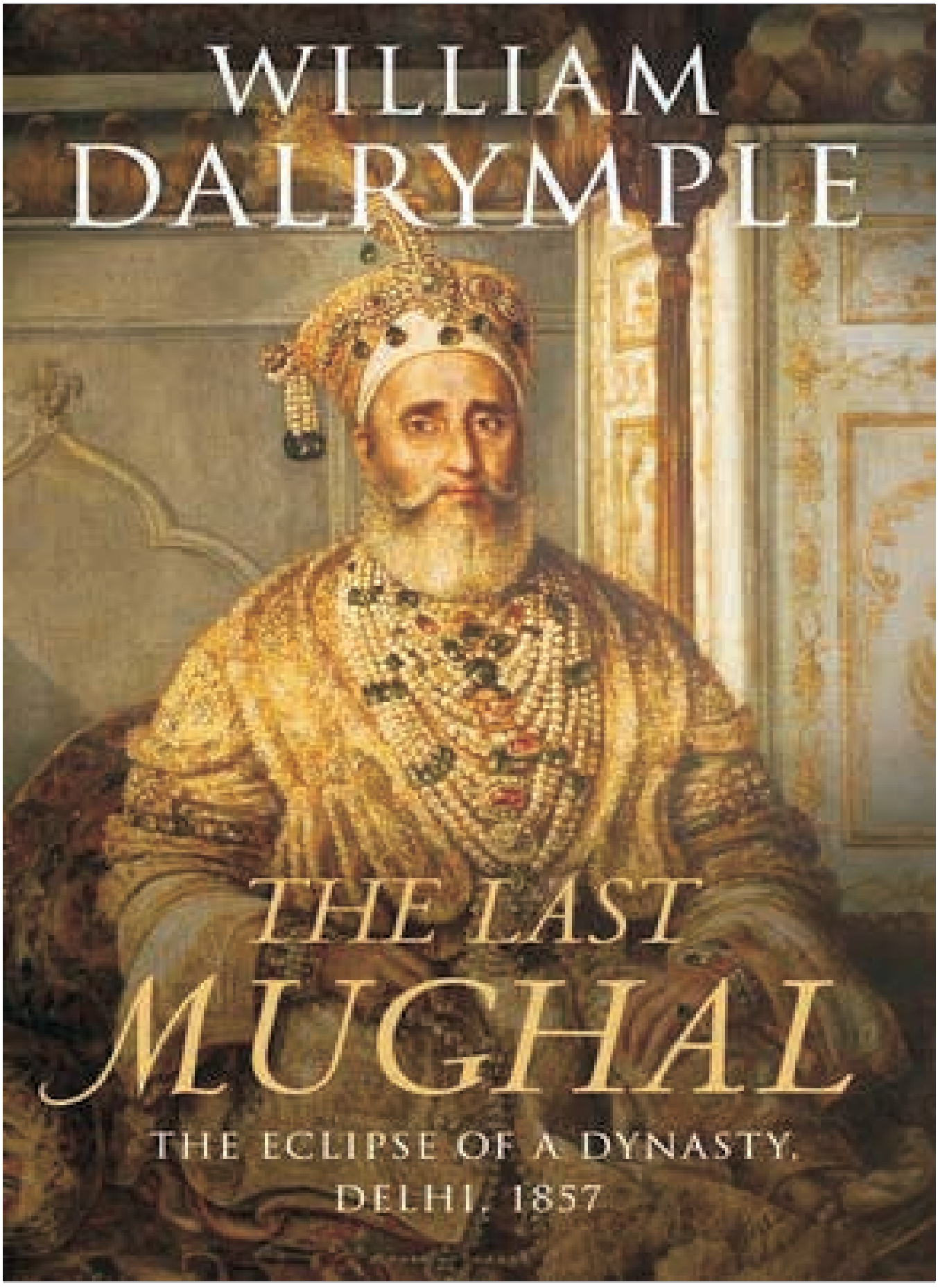
WILLIAM
DALRYMPLE
THE LAST
MUGHAL
THE ECLIPSE OF A DYNASTY,
DELHI, 1857

بک ریویئو: "دی لاسٹ مغل دی فال آف ڈائینسٹی .دہلی ۱۸۵۷ء"

حمزہ خان

دی لاسٹ مغل دی فال آف ڈائینسٹی .دہلی ۱۸۵۷ء ولیم ڈالریمپر کی لکھی گئی کتاب پینگوئن بکس لمیٹڈ رجسٹرڈ آفسز: ۸۰ سٹرینڈ لندن ڈبلیو سی ۲ آر، او آر ایل انگلستان سے شائع ہوئی۔

اس کتاب کا مطالعہ قارئین کو تاریخ کے دور میں لے جاتا ہے تا کہ وہ اپنی تاریخ کے سنہری پنوں پہ لکھی داستانیں پڑھیں۔ یہ کتاب دہلی میں انگریز اور ہندوستان کی ۱۸۵۷ء کی جنگ کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس میں بہت تفصیلاً جنگ کے حالات و واقعات کا تذکرہ کیا گیا ہے جو برصغیر کی تاریخ میں ایک داغ ہے۔ تاریخ سے لگاؤ رکھنے والوں کو یہ کتاب اسی دور میں لے جاتی ہے۔ اس کے مطالعے سے یہ جاننا شاید آسان ہو جائے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ کچھ قومیں صفحِ ہستی سے مٹتی چلی گئیں جب کہ کچھ نے دنیا پر راج کیا۔

کتاب کی شروعات بہادر شاہ ظفر دوئم کی برما (رنگون) کی جلا وطنی سے ہوتی ہے۔ بہادر شاہ برصغیر پاک و ہند کے "پادشاہ" تھے، (پادشاہ فارسی میں بادشاہ کو کہتے ہیں)۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ ۳۰۰ سال تک برصغیر میں حکمرانی کرنے والے شخص سے کس طرح سب کچھ چھن گیا یہاں تک کہ وہ ایک حکمران ایک حقیر شخص سے زیادہ کچھ نہیں رہا۔ اُسے اپنے ملک میں ہی شاہی تدفین کی اجازت تک نہ ملی۔ چند خاندان والوں اور قریبی رشتہ داروں کو بھی اس کی آخری رسومات ادا کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ یہاں تک کہ بامشکل چند لوگ ہی تھے جو یہ پہچان سکے کہ یہ بہادر شاہ ظفر کا جنازہ ہے۔ اس کے ورثاء (شہزادوں) کی تذلیل کی گئی۔ اسی تذلیل کے ساتھ ہی برصغیر میں برطانوی راج کا آغاز ہوا اور مغل خاندان کی مال و دولت اور شان و شوکت مٹی میں جا ملی۔ ایک دور کا اختتام ہوتا ہے اور دوسرے دور کی شروعات۔

کتاب کا زیادہ حصہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بارے میں ہے، جنگ کی واقعات اور بڑی تباہ کاریوں کو بیان کیا گیا ہے۔ کس طرح ایک طوفان نے پورے دہلی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، اور اس آگ کے شعلے میرٹھ سے اٹھے، جو کہ ایک نہایت اہم ضلع تھا اس لیے وہاں بڑی تعداد میں انگریز فوج کو انگریزی توپوں کے ساتھ وہاں تعینات کیا گیا۔ بادشاہ انگریزی توپوں کو بھی اپنے قبضے میں لینا چاہتا تھا اس کے خیال سے وہ اس طرح بازی جیت سکتا ہے۔ مرزا ابوبکر جو باغی فوج کے راہنماؤں میں سے تھا اس نے میرٹھ میں برطانویوں کے خلاف مہم چلانے کا فیصلہ کیا اور توپوں کو قبضے میں لے لیا، بہادر شاہ ظفر نے بھی اسکا ساتھ دیا۔ اور بہت ہی جلد فتح کی راہ پہ گامزن ہو گیا۔

انگریز ان باغیوں کی طرف سے اٹھائے گئے اقدامات سے حیران تھے، ان کو اس

کی توقع نہیں تھی۔ عام فوجیوں کے ساتھ ساتھ انگریز حکومت پر بھی حملے کیے گئے۔ اعلیٰ عہدیدار انگریز بھی اس سے نہ بچ سکے یہاں تک کہ کمشنر، مجسٹریٹ، کرنل جیسے ہی باغیوں کی ننگی تلواریں اپنی طرف اٹھتے دیکھتے اپنی جان بچانے کو

بھاگ پڑتے۔ جب دہلی کا اسسٹنٹ مجسٹریٹ تھیوفیلس میٹکالف امبالا پہنچا (جنرل ایکسن وہاں انگریز فوجیوں کے ساتھ تعینات تھا) تو ان لوگوں کے لیے یہ حیران کن بات تھی کیونکہ انکے خیال میں وہ ایک عرصہ پہلے مر چکا تھا۔

ہندوستانیوں کا خیال تھا کہ انہوں نے انگریزوں سے نجات حاصل کر لی اور بادشاہت کو امر کر دیا۔ کیا ان کو اس کا اندازہ تھا کہ انگریز دوبارہ متحد ہو کے حملے کا منصوبہ بنا رہے ہیں؟ بھارتی افواج جو کہ دہلی میں داخل ہو چکیں تھیں انہوں نے اپنی نام نہاد جیت کا جشن منانا شروع کر دیا، اسی اثناء میں برطانوی فوج نے متحد ہو کر دہلی کو گھیرے میں لے لیا۔ یہاں سے دہلی کے تخت کی صحیح جنگ کا آغاز ہوا۔

انگریز حکومت نے خوراک کی فراہمی منقطع کر دی، اب وہ انتظار میں تھے کہ انہوں نے جو جال بچھایا ہے اس سے بھارتیوں کو جکڑ سکیں گے۔ بھارتیوں کی اسلحہ کی طاقت انگریزوں کی توپوں کے آگے نہیں چل سکی تقریباً ۲۲ دن کے محاصرے کے بعد انگریز فوج بغیر کسی مذاہمت کے دہلی میں داخل ہو گئی۔ جب وہ شہر میں داخل ہو گئے تو انہوں نے وہی کیا جس کی ان سے توقع کی جا رہی تھی۔ انہوں نے فوجیوں کو قتل کرنا اور ان پر تشدد شروع کر دیا۔ عظیم الشان عمارات میں گھس کے وہاں کے مکینوں سے برا سلوک کیا۔ ظفر کے قلعے میں گھس کے شاہی خاندان کو پکڑ لیا اور ان کو جنگ کی سزا دی۔ انہوں نے نوجوان شہزادے کو اندھا کر دیا اور رنگون کے بادشاہ کو ملک بدر کر دیا گیا۔

اس کتاب میں صرف ۱۸۵۷ء کی جنگ کا تذکرہ ہی نہیں ہے بلکہ دہلی شہر کی زندگی کے بارے میں بھی بتایا گیا ہے۔ غالب اور ذوق جیسے لوگوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اگر کتاب کے واقعات صرف جنگ تک محدود ہوتے تو قارئین دلچسپی کھو دیتے۔ ان لوگوں کا تذکرہ پڑھنے والے کو اور مگن کر دیتا ہے۔

مصنف لکھتا ہے کہ ایک دن غالب اور ظفر شاہی باغ میں ٹہل رہے تھے : غالب بادشاہ کی بات پہ توجہ مرکوز رکھنے کی بجائے اس کی ساری توجہ باغ میں لگے آموں کی طرف تھی۔ جب بادشاہ نے اس سے پوچھا کہ وہ کیا تلاش کر رہا ہے تو اس نے بہت دلچسپ انداز میں جواب دیا کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ کس آم پہ میرا نام لکھا ہے تاکہ میں کھا سکوں۔ اگلے ہی دن بہادر شاہ ظفر نے آموں کی پیٹی غالب کو تحفتاً بھجوائی۔

اسی طرح مصنف نے پرانی دہلی کے حالات کا بھی ذکر کیا ہے۔ مصنف لکھتا ہے

کہ ذوق (جو کہ اردو کا مشہور شاعر تھا) کا مقبرہ نالیوں میں کھیں کھو گیا ہے اور غالب کی حویلی کا صحن کوئلے کی دوکان میں تبدیل ہو چکا ہے۔ بہت سی عمارتیں اور ان کے ڈھانچے وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہو گئے ہیں۔

۱۷ویں صدی میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کے رہن سہن کا ایک خوبصورت امتزاج بہت ہی دل لبھانے والے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ دہلی کے مشہور چاندنی چوک کے بارے میں بھی پتہ چلتا ہے کہ اس بازار کی رونقیں عشاء کی نماز کے بعد بڑھنا شروع ہو جاتیں ہیں اور ساری رات دوکانیں کھلی رہتیں ہیں۔ وہاں کے مشہور کباب اور مٹھائیوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے لوگ تنز ومزاح اور شاعری کے مقابلوں میں مشغول رہتے ہیں۔ اسی طرح شاہ ظفر کے دربار میں اہم شخصیات کی بھی یہی روایات تھیں۔ اکثر اوقات اپنے دربار میں بادشاہ خود مشاہروں کی میزبانی کرتا۔ ذوق اور غالب جیسے بلند مرتبہ شعراء دربار میں اپنا تازہ کلام بھی اسی امید سے سناتے کہ ان کو داد اور انعام واکرام سے نوازا جائے گا۔ یہ سرگرمیاں طلوعِ آفتاب اور فجر کی نماز تک جاری رہتیں۔ اور فجر کی نماز کے ساتھ ہی لوگ دربار سے رخصت ہوتے۔

تاہم انگریز اعلیٰ عہدیداران جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے دہلی میں تعینات کیے گئے تھے ان کی صبح کا آغاز بھی طلوعِ آفتاب سے ہو جاتا۔ شاندار ناشتے کے بعد وہ اپنی ڈیوٹیوں پر روانہ ہو جاتے، جن میں گشت کرنا بھی شامل تھا۔ ۱۲ بجے کا وقت گھر واپس آ کر کھانا کھانے اور قیلولہ فرمانے کا ہوتا تھا۔ آرام کرنے کے بعد کچھ خط و کتابت کرتے اور شام کی محفلوں کی تیاریوں کی مصروفیات شروع ہو جاتیں۔ یہ ہیں دہلی میں ۱۸۵۷ء کی جنگ سے پہلے کی زندگیوں کے اہم متضادات۔

تاریخ دوہرائی جاتی ہے۔ آج کے دور میں برصغیر کے راہنماء اور لیڈر ریاست کی دولت سے لطف اندوز ہوتے نظر آتے ہیں۔ ریاست کے پیسے میں کرپشن اور اپنی ذاتی خواہشات کے لیے ان کو استعمال کرنا بہت عام نظر آتا ہے۔ تاہم اگر دوسری جانب نظر دوڑائی جائے تو برطانیہ کی ریاست بہت ہی ذمہ دار اور اس سے بالکل مختلف ہے۔ وزراء اور وزیرِ اعظم ٹیکس کی ایک ایک پائی کے جوابدہ ہیں۔ شاید یہ ہی وقت ہے کہ ہم اپنی تاریخ سے کچھ سیکھیں اور اپنے سابقہ جاہ وجلال کو بحال کریں۔

دی لاسٹ مغل سی فال آف ڈائینسٹی. دہلی ۱۸۵۷ء کا شمار ان کتب میں ہوتا ہے جو تعلیمی حلقوں میں سراہی جاتیں ہیں۔ مصنف کی چند اور کتابیں جن میں سٹی آف ڈیجن، نائن لائیوز، اور ایک تازہ کوشش دی ریٹرن آف دی کنگ ہیں۔ اگر آپ تاریخ کے سنہری ادوار خاص طور پر برصغیر کے ادوار کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو یہ کتب اپنی مثال آپ ہیں۔

مصنف انڈو یجوئل لینڈ پاکستان میں ریسرچ ایسوسی ایٹ کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

فلم یا حقیقت ؟

فرحان خالد - سندس سیدّہ

ہم اپنے دوست کے گھر بیٹھے کافی سے لطف اندوز ہو ہی رہے تھے کہ اچانک اس کی محبِ وطن پاکستانی ہونے کہ حس جاگ اٹھی۔ ابھی اس نے بات شروع ہی کی تھی کہ "یار تمہیں میں پاکستان کی ایک اور کارکردگی کا....." کہ ہم سب چلا اٹھے 'اوئے ایک اور اچھی خبر؟ نہ جانے یہ شخص پاکستان کے بارے میں اتنی اچھی خبریں کہاں سے ڈھونڈ نکالتا تھا۔' ہمارے ملک میں جو حالات ہیں اس دور میں کہیں کوئی اچھی خبر دیکھنے اور سننے کو مل جائے تو ہم اسکو خوش قسمتی سمجھتے ہیں۔ ہاں تو میں بات کر رہا تھا پاکستان کے بارے میں ایک اور اچھی خبر کی۔

ہم سب کو مسکراتا دیکھ کر اس نے اپنا خبر نامہ جاری رکھا۔ یار تمہیں پتہ ہے کہ پاکستان میں ایک نئی اردو فلم "زندہ بھاگ" ریلیز ہوئی ہے؟ کیا فلم ہے یار .....۵۰ سالوں میں یہ پہلی فلم ہے جو آسکر ایوارڈ کی دوڑ میں شامل ہوسکتی ہے۔ ٹورانٹو میں یہ فلم ۴ ایوارڈ زجیت بھی چکی ہے۔ اب تو مجھے ۱۶ جنوری ۲۰۱۴ء کا انتظار ہے بس۔ میں نے پوچھا کیوں؟ تو اس نے کہا کہ اسی دن پتہ لگے گا کہ یہ آسکر کے لیے منتخب ہوتی ہے یا نہیں۔

اب بات پاکستانی فلموں اور فلم انڈسٹری کی ہو رہی تھی تو بھلا ہم پیچھے کیسے رہتے؟ ہم بھی لگے پاکستان کی فلم انڈسٹری کو برا بھلا کہنے اور اس کی تباہی کی وجوہات تلاش کرنے۔ کہیں ہم لولی وڈ کی برائی کرتے تو خود ہی اس کی تعریف بھی کرنے لگتے۔ اگر پاکستانیوں میں اتنی صلاحیتیں ہیں کہ وہ انڈین فلم انڈسٹری کے لئے کام کر سکتے ہیں تو پھر یہ کمی کہاں ہے؟ کیا ہمارے ڈائریکٹرز اور پروڈیوسرز حضرات کام کروانا نہیں جانتے۔ یہ معیار کی کمی آخر کہاں سے شروع ہو رہی ہے؟ لیکن میرے خیال میں ہمارے ملک میں کسی بھی طرح کی کوئی کمی نہیں ہے۔

آپ خود ہی بتائیں میں درست ہوں یا نہیں؟ ایک وہ دور بھی تھا جب پاکستان اور بھارت کی فلمیں مقابلے پر ہوتیں تھیں۔ ہمارے ایکٹرز، ڈائریکٹرز، پروڈیوسرز اور رائیٹرز اپنی مثال آپ ہیں۔ لیکن پھر نہ جانے کہاں کمی رہ گئی کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جہاں بالی وڈ ترقی کی راہوں پر گامزن ہوتا گیا وہاں لولی وڈ کا نام بدنام ہوتا گیا۔ لائٹس، کیمرا، ایکشن کی آوازیں سٹوڈیوز سے غائب ہونے لگیں۔ ہم نے اس کا ذمہ دار بھی پاکستان کے اقتصادی، سیاسی اور سماجی حالات کو ٹھہرا دیا، لیکن اگر دیکھا جائے تو بھارت کے حالات بھی پاکستان سے کچھ مختلف نہیں۔

لیکن اب کس مسیحا کا انتظار تھا؟ آخر کون ہے جو پاکستان کی اس انڈسٹری میں دوبارہ جان ڈالے گا۔ کوئی بین الاقوامی طاقت ہماری اس میں مدد نہیں کرے گی۔ ہمیں اپنے تمام وسائل کو بروئے کار لانا ہوگا۔ ہمیں اس کو بہتر بنانے کے

لیے کوشش کرنا ہوگی۔ اور پھر وہ دن آ ہی گیا وہ مسیحا جس نے ہماری مشکلات کو جانا، ملک کے حالات پہ نظر ثانی کی، کہیں کوئی قلم اٹھا کہیں کسی نے خود کو ان مسائل کی عکاسی کے لیے تیار کیا تو کسی نے اس کو ہمارے تک پہنچانے کے لیے ہر وہ کوشش کی جس سے وہ ہماری، اپنی اور لولی وڈ میں جان ڈال سکیں۔ اور ذمہ دار شہریوں میں یہ شعور اجاگر ہو ہی گیا جس کے نتائج بہت زود افشاں نکلے۔ ہمارے پرائیویٹ میڈیا کے ادارے آگے بڑھے اور چند فلموں کو متعارف کروایا۔

یوں لگا کہ کچھ لوگوں نے پاکستانی سینما کو دوبارہ آباد کرنے کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ گزشتہ چند برسوں میں ایسی بہت سی فلمیں بنی ہیں جن کی وجہ سے سینما دوبارہ آباد ہوگئے اور فلموں کے شیدائیوں کو یہ فلمیں سینما تک لے ہی آئیں۔ لیکن یہ کیا؟ پہلے تو فلموں میں پیار محبت کے گانے بجتے تھے، ان نئی فلموں نے تو اسکا رجحان ہی بدل کے رکھ دیا ہے۔ اور یہ تمام نئی فلمیں نہایت دلچسپ اور تقریباً ایک ہی طرح کا پیغام کو سامنے رکھ کر بنائی گئیں تھیں، اور وہ تھی 'دہشتگردی'۔

لیکن یہ تو بارش کا پہلا قطرہ تھا۔ ابھی تو صدیوں سے بنجر اس میدان کو اس برسات کا انتظار تھا جو لولی وڈ کی دنیا کو سرسبز و شاداب کر دے۔ یہاں سے قحط سالی کا یہ دور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جائے۔ اب ہم اس مقام پر ہیں کہ ہمارے ملک کی فلمیں نہ صرف سراہی جا رہیں ہیں بلکہ آسکر ایوارڈ کے لیے بھی ان پر سوچ بچار ہو رہی ہے۔ اس تمام کامیابی کی وجہ کیا بنی اور کون سی فلمیں اس دوڑ میں شامل رہیں میں ان کے بارے میں بھی بات کرنا چاہوں گا۔

کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ "ہر عمل مسائل کی عکاسی کرتا ہے" ہمارا سینما بھی اسی قول کی عکاسی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ حقیقت پر مبنی فلمیں جو ان چند سالوں میں بنا ئی گئیں وہ صحیح معنوں میں پاکستان کے مسائل کی عکاسی کرتیں ہیں۔ میں نے 'حقیقت پر مبنی فلموں' کا لفظ صرف اردو فلموں کے لیے استعمال کیا ہے۔ پنجابی فلمیں حقیقت میں لولی وڈ کی فلموں تو ہیں لیکن یہ ہماری دیہی زندگی کے صحیح عکاسی نہیں کرتیں۔ کھیتوں میں ناچتی ہیروئن اور اس کے گرد اسلحہ اور ڈانگ اٹھا کے پھرتا ہیرو یہ تو ہمارے ملک میں نہیں ہے۔

لولی وڈ کی دنیا میں تھلکا مچانے والی فلموں کا آغاز ۲۰۰۷ء کی ایک فلم " خدا کے لیے " سے ہوا۔ ایک ایسی فلم جو کہ ملک میں دھشتگردی کے حالات، انتہا پسند عناصر اور اس کے نتیجے میں ہونے والی تباہ کاریوں کے گرد گھومتی نظر آئی۔ یہ سفر یہاں ختم نہیں ہوا ابھی لوگ اسی جوش میں تھے کہ لولی وڈ کی دنیا دوبارہ آباد ہو گئی ہے کہ ایک اور فلم "بول" نے لوگوں کے دلوں کی دھڑکنیں اور تیز کر دیں۔ یہ فلم بھی ان ہی تمام مسائل کو اپنے طور پر پیش کرتی نظر آئی۔ لوگوں کی طرف سے داد سمیٹتی اور ان کے دلوں پر راج کرتی اس فلم نے فلم انڈسٹری کے باقی لوگوں کے بھی حوصلے بلند کیے۔

اسی طرح اور بھی لوگ ان موضوعات پر مبنی اور اسی طرح کے مسائل کو فلموں میں اجاگر کرنے لگے۔ شاید ان کے حوصلے بلند ہو گئے تھے کہ اب بھی لولی وڈ میں جان باقی ہے۔

جتنا زیادہ ہم دہشتگردی کے مسائل سے دوچار ہیں ان کی عکاسی صحیح معنوں میں بات کر سکتے ہیں، جنہوں نے پرانی اور نئی نسل کو دوبارہ اکٹھا کر دیا ہے۔

اب ۲۰۱۳ء میں بھی ۲ نئی فلمیں آ رہی ہیں "وار" اور "آپریشن ۲۱" ابھی سے عوام ان فلموں کا انتظار کر رہی ہے۔ امید کی جا رہی ہے کہ یہ فلمیں بلاک بسٹر ثابت ہوں گی اور لوگوں کے دلوں پر نہ صرف راج کریں گی بلکہ ان کی بدولت ایک دفعہ پھر ہماری اپنی فلم انڈسٹری بحال ہوگی۔

یہ فلمیں کرتیں ہیں۔ اب شاید ہماری فلم انڈسٹری والے بھی جان گئے ہیں کہ ہم حقیقت دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہمیں کسی اور سیارے یا کسی اور دنیا کو اپنے سینما میں نہیں دیکھنا۔ میں بہت خوش ہوں کہ میرے گھر والے میرے والد بھی اب ان فلموں کی بات کرنے لگے ہیں۔ وہی دور دوبارہ لوٹ آیا ہے جب وہ ہم سے اپنی جوانی میں دیکھی گئی فلموں کی بات کرتے تھے۔ ان فلموں نے صرف سینما آباد نہیں کیے بلکہ آج کے اس تیز دور میں جہاں ہمارے لیے وقت بہت کم ہے ہر شخص فارغ اوقات میں اپنی پسند دیکھنا چاہتا ہے، اب ایسی فلمیں آ گئیں ہیں جو ہر دل کی دھڑکن ہیں جو ہم خاندان والوں کے ساتھ بیٹھ کے دیکھ سکتے ہیں جن پہ

مجھے بہت امید ہے کہ یہ سفر یہیں تمام نہ ہو بلکہ سینما کی بحالی اور اس کے قائم و دائم رہنے کا سبب بنے۔ ہم نے کامیابی کی سیڑھی پر قدم رکھا اور کامیابی کے زینے پار کرتے چلے گئے۔ لیکن یہ سفر ہی ہماری منزل ہے۔

مصنف انڈوبیجوئل لینڈ پاکستان میں پروگرام افسر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

ادارے سے آگاہی

انڈو یجوئل لینڈ پاکستان ایک متحرک، غیر جماعتی اور غیر منافع بخش رجسٹرڈ سول سوسائٹی ادارہ ہے۔اس کا بورڈ کل پانچ ارکان پر مشتمل ہے، جبکہ روزمرہ کے معاملات اس ادارے کے ڈائریکٹر کی ذمہ داری ہے۔ قیام سے لے کر آج تک اس ادارے نے حکومتی انتظامات، قانون کی بالادستی، میڈیا اور مراسلاتی، ہنر، سول سوسائٹی کے استحکام اور جمہوریت کی ترقی کے لئے کام کیا ہے۔

انڈو یجوئل لینڈ نے واضح طور پر قانون دانوں اور دیگر سول سوسائٹی اداروں کے ساتھ مختلف حیثیتوں میں کام کیا ہے اور خصوصاً میڈیا سے تعلق رکھنے والے افراد کی تربیت کے حوالے سے اس کا نام پورے پاکستان میں جانا جاتا ہے۔

اشاعت

میڈیا سے متعلق

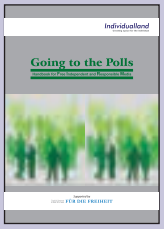

تنازعاتی تجزیے اور انتہا پسندی کے خاتمے سے متعلق

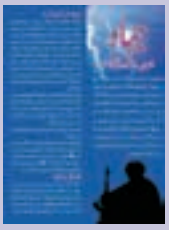

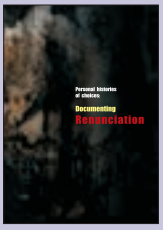

پاکستان پولیس خواتین

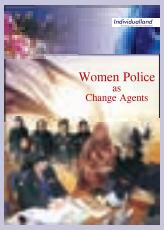

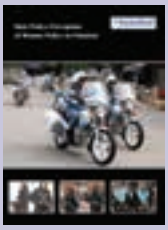

فرد میگزین

حکومت اور احتساب

اقتصادیات

اگلی اشاعت مئی ۲۰۱۴ میں

Find us
Individualland
Individualland